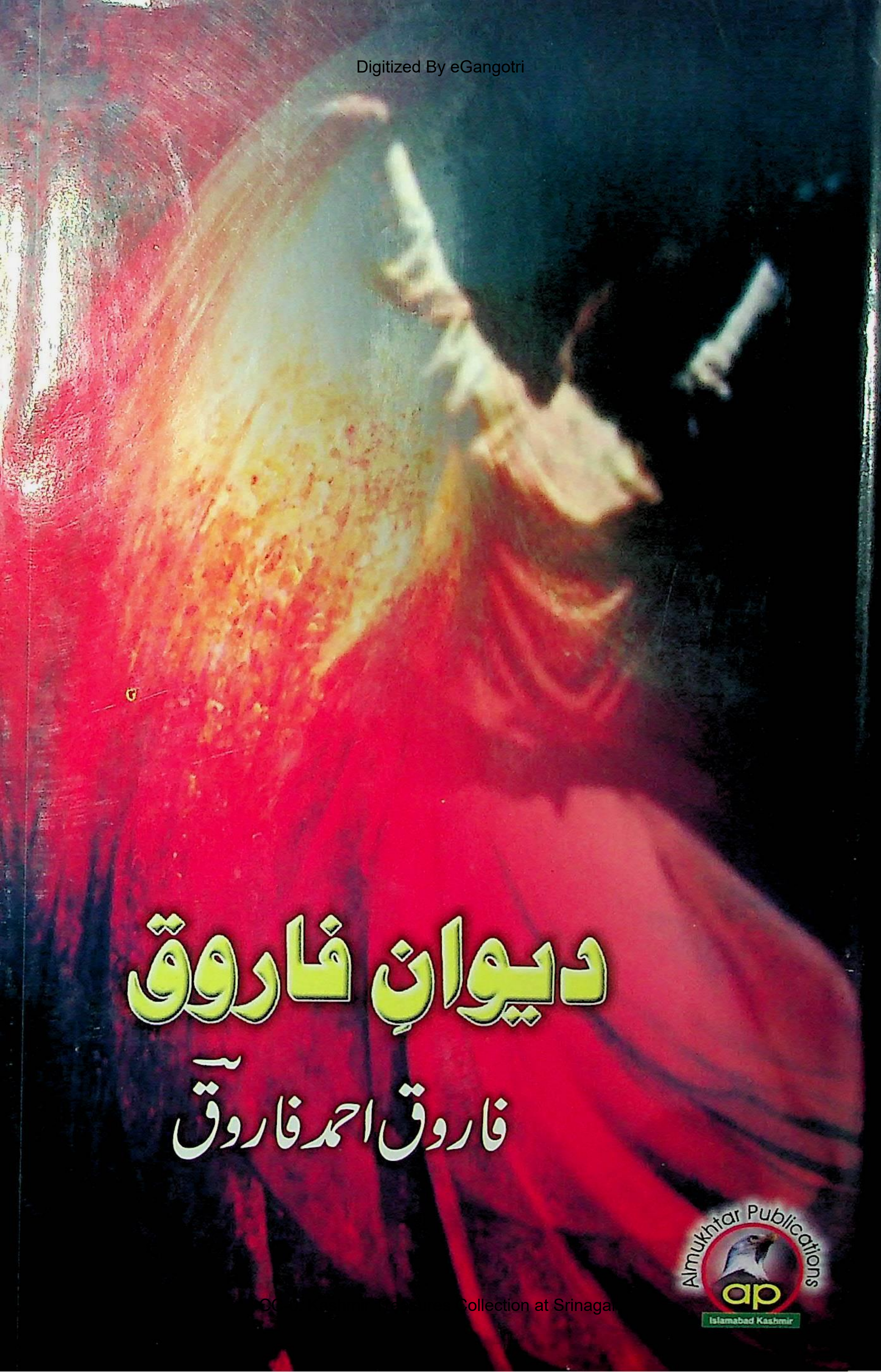


دیوانِ فاروق

فاروق احمد فاروق

Almukhtar Publications
ap
Islamabad Kashmir

دیوانِ فاروق

اک خامہ اِک بیاض بصورت کتاب میں
میری مکمل زندگی اِک انتساب ہے

فاروق احمد فاروقؔ

نام کتاب: دیوانِ فاروق

صنف: شاعری

مصنف: فاروق احمد بٹ (فاروق احمد فاروقؔ)

ولدیت: غلام قادر بٹ

تاریخ پیدائش: ۱۹رنومبر ۱۹۷۱ء

پیشہ: مُدرس تعلیم: ایم،اے

پتہ: اقبال کالونی، انچی ڈورہ، انت ناگ جموں وکشمیر

کمپوزنگ حناقوسین

سرورق: عادل مختار

طباعت: المختار پبلیکیشنز اسلام آباد کشمیر

قیمت: -/250 (دوسو پچاس روپے)

کتاب ملنے کا پتہ: کتاب گھر لال چوک سرینگر ر جموں

سکندر نوز ایجنسی سرینگر

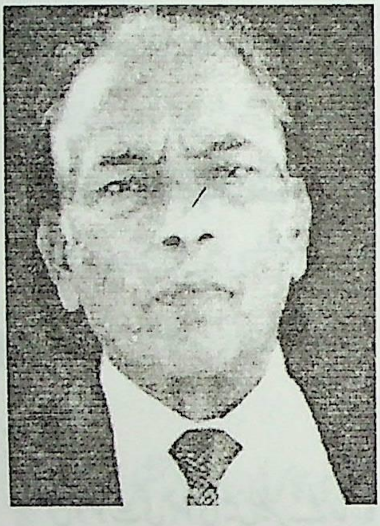
المختار پبلی کیشنز نئی بستی اسلام آباد

سال اشاعت: ۲۰۱۴

فون: 9906677643 9906482111

E.mail: farokahmadfarok@gmail.com

اِنتساب



اپنے مرشد جناب میرؔ محمد سلیم

کے نام

"سلیمی میرؔ کی حائل ہوئی میری ہلاکت میں

وہی فاروقؔ اس وضعِ نو اشعار میں گُم ہے"

فاروق احمد فاروقؔ

مشمولات

☆ میں ہر اِک دہر پہ اثر چھوڑ آیا

☆ ہے دم اپنا اپنا، عدم اپنا اپنا

☆ روح رہ جائے گر پھر بھی گروہ جاں لے جائے گا

☆ حقیقتوں کے شہر میں وہ خواب بیچتا رہا

☆ بھول کر راہِ طریقت خود ارادی ہو گیا

☆ آپ کو ہم مفلسی میں اپنے گھر لائینگے کیا

☆ مورت جیسی عادت رکھنا

(ب)

☆ نظیری کا کوئی سامان کر تمثیل میں یارب

☆ فقیری کا ذہن پہ راج ہے اب

☆ سرائے گل سے گزر گئے سب

☆ ہوئے زر کی خواہش میں احباب غائب

(پ)

☆ اس بار میری آرزو کو اختیار سونپ

(ت)

☆ طاغوت در تابوت ہے، تابوت در طاغوت

☆ آساں نہیں ہے زندگی آسائشیں بہت

☆ یقین تو نہیں کہ شہر ہے سلامت

(ٹ)

☆ زردی ہے سچی اور چہرے کا نکھار جھوٹ

☆ بنیے کے سینے میں چھپے سر کھولتے ہیں باٹ

(خ)

☆ ہر اِک جا ہر اک راہ پہ جا بجا یخ

(د)

☆ وطن کی ہے اگر پہچان سرحد

☆ رات کے بے نور چہرے پر عیاں ہے چاند

☆ راستے کی کھال پیروں سے اُتر جانے کے بعد

(ڈ)

☆ خودروی میں خودسری سے بے ثمر ہوا ہے جھنڈ

(ذ)

☆ تعویز ہو گیا ہے تیرے نام کا کاغذ

(ر)

☆ عرش کی اور فرش کی تسخیر پہ اُس کی نظر

☆ وہی بوئے فطرت وہ نغمہ جاں پھر

☆ میرے سر پہ احسان آجائے تو پھر

☆ کرے نہ کچھ کام کاج شاعر

☆ میرے شہر کو اِک بیابان کہہ کر

☆ آ جاتے ہیں وہ بزم میں بنتا ہے سماں اور

☆ چہرے بدلنے کا وہی اِک کھیل پھر

(ڑ)

☆ بُت تراشی کا ہے جوہر اور پہاڑ

(س)

☆ چمن میں مادیت کا غُل ہے اور بے حال بُلبل بس

☆ مقدر کے آگے ہے انسان بے بس

☆ اِک خامہ، اِک بیاض بصورت کتاب بس

(ش)

☆ خوش نما جلوہ لئے اِک حسن کی تصویر کاش

☆ روز و شب کے درمیاں اک کشمکش

☆ دیوار و در سہمے ہوئے ہر اِک مکاں خاموش

(ص)

☆ دل خاک اُلفت سے ہوا اور جان بالخصوص

(ض)

☆ شاعر تو ہو نہ پائے ہم کبھی مگر بیاض

☆ سمٹتے، بکھرتے بحور اور ارض

(ط)

☆ ہر اک ذہن پہ مادیت کا تسلط

☆ تدبیر تھی موزوں مگر نقش قدم غلط

(ع)

☆ ہر اک صبح طالع، ہر اِک شام طالع

(غ)

☆ نہیں ہے خطرا مکانی سے فارغ

(ف)

☆ میری ابتدا، انتہا کے اے واقف

(ق)

☆ حقیقت رنگ و بو کی ہے مکان حادث مکیں مطلق

☆ نظر میں طمطراق اور ذہن میں طمطراق

(گ)

☆ باتیں گڑھنے والے لوگ

☆ خوف کے سائے میں پلتے ہیں سارے لوگ

(ل)

☆ میرے نفس کا آبگینہ میرا دل

☆ اے طائرِ بے حس کبھی اُڑنے کے پر نکال

(م)

☆ نمایاں نورِ ازل کی حسین رعنائیاں ہیں ہم

☆ شیشے کی خو لے آئے پتھر کے دیار ہم

☆ کہانیوں کی کتاب میں گُم

☆ اگر تم ہو کہاں ہوں میں اگر میں ہوں کہاں ہو تم

☆ بارہا غم سے اُبھر کر پھر بکھر جاتے ہیں ہم

(ن)

☆ قلندر وقت سے ہٹ الگ انداز رکھتے ہیں

☆ سلامت ہے دل تو سلامت زباں

☆ بگولے آ کے مٹی کے اِجارے خوب لیتے ہیں

☆ دل تو ہے سینے میں نورِ دل نہیں

☆ حق رسیدہ نہ اسلاف دیدہ ہوں میں

☆ تیری یاد نے گر رُلایا ہمیں

☆ میری نکتہ چیں ہر زباں ہے یقیناً

☆ ہمارے ہاتھ سے قدرت نے کیا جوہر دکھائے ہیں

☆ ہے دورتو عالمگیری کا، سرحد کی کہانی کہتے ہیں

☆ کئی دن سے دلبر اُلجھتے نہیں ہیں

☆ جدھر دیکھتا ہوں جہاں دیکھتا ہوں

☆ کال ہوئی موصول بنا ہے آج کا دن ہڑتال کا دن

☆ مقامِ غیر ہے زیبا کلام کرتے ہیں

☆ آؤ ہر اک رسم دنیا کی نبھانی ہے تمہیں

(و)

☆ خاک کے ذرے سے بے حد نور افشانی نہ ہو

☆ ہیں چہرے پہ بکھرے سیہہ فام گیسو

☆ نظر لگ گئی شہر کے نوجواں کو

☆ اگر چشم بینا ہو بے نور کیوں ہو

☆ خون ہو لیکن لال نہ ہو تو؟

(ہ)

☆ کندھے پہ تیر دان دست میں کمان رکھ

☆ گھر کا اندر باہر پیسہ

(ی)

☆ واجبی تمثیل ہے یہ زندگی

☆ کہر آلودہ سی شب میں تمہاری دید ہو جاتی

☆ لہو موجود ہونے کی بدن سے بو نہیں آتی

☆ روش ہو گئی ہے بے اثر توڑ ڈالی

☆ میرے ہونے نہ ہونے میں نہ تھا کچھ بھی مگر پھر بھی

☆ رگ رگ میں ہے اُترا پانی

(ے)

☆ نگاہِ ناز پُر انداز جب میخانہ بنتی ہے

☆ خودیٔ لانہایت کے لئے امکان میں امکان ہے

☆ دروں میں جھانک کر پیدا کبھی سوز جگر کردے

☆ مجھے معلوم کیا اس رنگ و بو کی کیا حقیقت ہے

☆ فقط آئینہ داری ہے نشانی ایک ہی تو ہے

☆ کس نے کہا فُقرت کی شہہ سے گھر اُلٹتا ہے

☆ منزل نہ پوچھ رہگزر کے دل میں جھانک لے

☆ دوئی گمراہ کرتی ہے ذہن جب خام ہوتا ہے

☆ میری وادی میں یوں فنکار کا انجام ہوتا ہے

☆ کس قدر مہنگے اُجالے پڑ گئے

☆ بند پلکوں کی گلی میں یار میرا ہے تو ہے

☆ مُصور رنگ و بوئے خوبیٔ شہکار میں گُم ہے

☆ کہاں سے قلب لوں جو جلوۂ انوار میں گُم ہے

☆ حال سراسر پتھر کا ہے

☆ پسینہ اوس کا آئے فضا نمکین ہو جائے

☆ قلم پہ نیاز ور پڑنے لگا ہے

☆ جذبۂ وحس کے شرارے کھو گئے

☆ بھٹکتی شئے گزرتے کارواں میں آہی جاتی ہے

☆ شعر لکھتا ہے وہ اونچا نام پانے کے لئے

☆ نہ فن سے ہے رغبت نہ ہی گلبدن سے

☆ رات کی کھڑکی کھلی تاریک سا منظر لئے

☆ تواریخ وادی میں یہ باب کیوں ہے

☆ درخشاں تیرا رُوقمر سا اگر ہے

☆ یہ دنیا بھی اک نسخۂ سامری ہے

☆ کلیسا و دیر و حرم میں نہیں ہے

☆ سخن وری عام ہوگئی ہے

☆ دل شکن انداز دلبر دلنوازی کیا کرے

☆ ہے تاثیر گفتار گر مختصر ہے

☆ یہاں انجام سب کا نقش بر دیوار ہوتا ہے

☆ دنیا کی پہچان نہیں ہے

☆ حصارِ عہد وفا میں وہ بند ہوگیا ہے

☆ ساقی نے جب زیور بدلے

نظمیں

☆ دلِ بے گل

رباعیات

قطعات

میری ابتدا ، انتہا کے اے واقف
مجسم میں آجا نہاں میرے واقف
سکوں بخش دنیا کی ہر شئے ہے لیکن
حقیقی نہیں کچھ کہاں جائے واقف
فدؔا قیدِ ہستی کے پہلو یہی ہیں
مزے بے خبر لے، سزا پائے واقف

سلامت ہے دل تو سلامت زباں
نہیں تو ہے مثلِ قیامت زباں

پیش لفظ

۵ / مارچ ۲۰۱۲ ء کو مجھے قادری فاضلی دربار کے جناب میر محمد سلیم صاحب نے اپنے حلقۂ ارادت میں لے لیا دربار کی وابستگی سے میرے لفظ اور اُن کے معنی بدلنے لگے۔ شاعری کا شوق مجھے پہلے سے ہی تھا اور فداؔ تخلص کرتا تھا۔ فاروق احمد فداؔ کے نام سے میری کئی غزلیں مختلف رسائل میں چھپ چکی ہیں۔ کلچرل اکادمی کے شیرازہ (ہم عصر نمبر) میں بھی اسی نام کے ساتھ شامل ہوا ہوں۔ قادری فاضلی دربار کے جناب لسہ خان فداؔ (اسلام آبادی) بھی فداؔ تخلص کے تحت کافی پختہ کلام لکھ چکے ہیں اور صوفی و ادبی حلقوں میں اُن کی چھاپ بدستور قائم ہے۔ اس لئے میرے مرشد جناب میر محمدؐ سلیم نے میرا نام بدل کر

فاروق احمد فاروقؔ رکھدیا۔ یہ نام سنتے ہی میرے شعورودل نے گواہی دی کہ یقیناً یہ میرا حقیقی نام ہے۔ نتیجتاً میرا تخلص فداؔ سے بدل کر فاروقؔ ہوگیا۔

نئے نام کے ساتھ شاعری کا آغاز ادبی حلقوں میں ایک کنفیوژن کا باعث بنا۔ جس کو دور کرنے کے لئے میں اپنی اردو شاعری کو ''دیوانِ فاروقؔ'' کے نام سے شائع کررہا ہوں۔ ورنہ دیوان کی اشاعت کے لئے نہ میرا تجربہ کافی ہے اور نہ ہی میری عمر.....!

فاروق احمد فاروقؔ

اَنچی ڈورہ، اسلام آباد

۲۰۱۴ء

ہر نفس کو موت کی جھولی میں بھر لے جائے گا
کیا خبر آئے کِدھر سے اور کدھر لے جائے گا

باغ شبنم، پھول، سبزہ رہ بھی جائیں گے مگر
مختصر سا کام کر لے گا نظر لے جائے گا

بس وہی جو تیرے اندر اور باہر ہے بسا
اُس کا ہی احساس تیرے سارے ڈر لے جائے گا

جھانک لے گا دل میں اور حیرت میں ڈالے گا تُجھے
ہوگئے بے گھر تو تم کو اپنے گھر لے جائے گا

عشق کے دریا میں نہلا کر تیرا ادراک سب
چھین کر گفتار سے تیرا اثر لے جائے گا

ہے یہی شیوہ ازل سے وہ ہواؤں کے عوض
بے خبر بن کر تیرے سب بال و پر لے جائے گا

جیب میں ڈالے قلم بے خوف چلتا ہے فدؔا
کون رہزن ہے جو یہ شئے چھین کر لے جائے گا

مادّیت سے جو بے آس ہو جائے گا
امتحاں میں وہی پاس ہو جائے گا
آسمانوں میں جاکر بھٹک جاؤ گے
خود میں جھانکو تو وشواس ہو جائے گا
مردِ کامل سے حاصل تو کر نورِ دل
پھر محبت کا احساس ہو جائے گا
بوند پہ جس جگہ پرتوِ حق پڑے
خود سمندر وہاں پیاس ہو جائے گا
من کی دنیا پہ اُترے گا پیغام حق
تن کی دنیا میں قرطاس ہو جائے گا
عشق کی لو پہ فاروقؔ اس کو تپا
کوئلہ تیرا الماس ہو جائے گا

بہے جو ساتھ اشکوں کے تو کاجل کہہ نہیں سکتا
محبت کے ستائے کو میں پاگل کہہ نہیں سکتا

نزاکت کا ادب ملحوظ ہے سچ کو چھپاتا ہوں
کسی کی مست آنکھوں کو میں دلدل کہہ نہیں سکتا

جہاں خوابوں کی چادر اوڑھ کر بچہ ہوا غافل
وہی جنّت ہے یا ہے ماں کا آنچل کہہ نہیں سکتا

لہو بہتا رہا میری زمیں دھوتی رہی دامن
نچوڑے ہیں فلک نے کتنے بادل کہہ نہیں سکتا

نہ ہوں انجام سے واقف نہ ہی آغاز سمجھا ہے
ہے دو دن زندگی اس کو مفصّل کہہ نہیں سکتا

تعیّن کے شکنجے میں بہت گھٹتا ہے میرا دم
اُڑاں کے واسطے ہوں کتنا بے کل کہہ نہیں سکتا

شکارے تھام کر ساحل جھٹک دیتے ہیں دامن کو
فداؔ کیچڑے میں ڈوبی جھیل کو ڈل کہہ نہیں سکتا

صِفر کی حد میں صد امکان رکھنا
اُسے بے جان میں ہے جان رکھنا
سماعت اور بیاں سے ہے جو قاصر
ہے ایسی بات پہ ایمان رکھنا
صداؤں میں ہیں تصویریں نمایاں
کھلے آنکھوں کے دونوں کان رکھنا
محبت کی گِرہ کا ہوں میں قیدی
مجھے لمحوں کو ہے حیران رکھنا

تفکّر کو ہے آوارہ مزاجی
ہے مشکل ذوق میں اوسان رکھنا
یہ دنیا جس کی جُنبش پہ ٹِکی ہے
اُسے کہنا کہ میں ہوں دھیان رکھنا
وہی غائب وہی فاروقؔ حاضر
مجھے کہتا ہے تُم میزان رکھنا

عکس ہے موجود دل پہ رونقِ انوار کا
شمس کی تھی نورِ افشانی کہ رُخ دلدار کا

لب پہ ہے انکار کا اور دل میں ہے اقرار کا
اِک عجب ہی فیصلہ ہے پیکرِ گلنار کا

گھر تیرا میری نظر کی حد میں اور وصل کا
فاصلہ کچھ بھی نہیں احساس سرحد پار کا

فصلِ گُل کے شبنمی ماحول میں آمد تیری
مرغِ دل بسملِ ہوا اس فطرتی یلغار کا

دل صنم خانہ میرا ہے اور صنم بے داد گر
کیوں فغاں پیکر نہ ہو خاکہ در و دیوار کا

پھر کوئی کہہ دے فدؔا کہ بات میں دم ہی نہیں
گر صنم عنوان ہو جائے میرے گفتار کا

رنگ و بو کے حِس جگا کر سو گیا
گِل کی اِک ہانڈی میں ساگر سو گیا

جاگنے میں کٹ گئے صد ہا جنم
آ گیا جب روز محشر سو گیا

نیند میں مرنے کا خدشہ جب پڑا
نام اپنے رب کا لے کر سو گیا

عشق میں مخمل کا بستر چھوڑ کر
مِل گیا رستے کا پتھر سو گیا

نیم شب کو بھی ادھورا ہی رہا
اوڑھ کر کاغذ سخن ور سو گیا

سچ اُگلتا تھا قلم، شاعر فدا
رکھ کے سرہانے پہ خنجر سو گیا

سِتاروں کا دلکش سماں چھُو لیا تھا
زمیں چھوڑ کر آسماں چھُو لیا تھا
نشاں بھی نہیں شیشۂ منتشر پہ
اِسے تم نے جانے کہاں چھُو لیا ہے
میری آرزو تب جواں ہو گئی تھی
تیرے شوق کا آستاں چھُو لیا تھا
جہاں زندگی کو تیرا آسرا تھا
وہیں مرحلے کا نشاں چھُو لیا تھا
نہ رحمت تیری جوش میں آئی تو کیا
دعاؤں نے طرزِ اذاں چھُو لیا تھا
فدؔا آندھیاں کیوں نہ لے جائیں حسرت
کہ گُل رُو نے میرا مکاں چھُو لیا تھا

آگ پر شبنم کی ہستی کو بسر کرتا ہوا
لمحہ لمحہ شوق کی بستی میں گھر کرتا ہوا

ایک وعدہ ہے وفا ہونے کی کوشش میں محو
اس مجسّم کو میرے زیر و زبر کرتا ہوا

نا اُمیدی کے رسن میں اک تصّور بے وجہ
آرزوؤں کی خلش کو تیز تر کرتا ہوا

میرے پہلو سے صدا گمنام سی آتی ہوئی
اِک سخن ور باتوں میں اثر کرتا ہوا

خسروِ انجم کی صورت میں ہے رخشاں کوئی حِس
زندگانی کی سیاہی میں سحر کرتا ہوا

اِک زماں تہذیب و، ملّت کا کوئی پنہاں عدو
گاؤں کی بستی کو دھیرے سے شہر کرتا ہوا

اِک قلم کہ گامزن انشا کی راہوں پہ فدا
گم شدہ ہے اور دنیا کا سفر کرتا ہوا

چمن رنگ و بو کا سجانا ہی کیوں تھا؟
چمن میں مجھے پھر بُلانا ہی کیوں تھا؟

میری خُو سے واقف تو تھا پیشتر ہی
کسوٹی پہ پھر آزمانا ہی کیوں تھا؟

جو دوزخ کا ہی خوف بھرنا تھا مجھ میں
تمنا کو میری جگانا ہی کیوں تھا؟

کیا مجھ میں اپنا تخیّل عیاں گر
حقیقت کو اپنی چھپانا ہی کیوں تھا؟

نہ تھا جب میرے سُر کا ہی تاب تُجھ میں
تو اس راگ کو گنگنانا ہی کیوں تھا؟

فدؔا جب ہواؤں کا کچھ تجربہ نہ تھا
تو پھر ریت کا گھر بنانا ہی کیوں تھا

کبھی دانستگی میں آ، کبھی انجان بن کر آ
اے دلبر خواب سا اِک بے محل مہمان بن کر آ

نہ میرے ہر سخن کی داد دے کر دلنوازی کر
میرے ہمدم میرے ہر شعر کا میزان بن کر آ

یہ دل اُکتا گیا ہم رنگ فطرت سے صنم تیری
کبھی بن کر معمّہ آ، کبھی آسان بن کر آ

جبیں کے اس نوشتے کو ذرا رکھ طاق نسیاں میں
ذرا اے مشکل بے حل کبھی احسان بن کر آ

نہ دم بھر منزلت کا یوں میری توہین ہوتی ہے
کروبی میرے گھر پر آ مگر انسان بن کر آ

غزل کو وسعتیں دے کر فدؔا پیدا اثر کر دے
تکلف کی حدوں سے تُو نکل پہچان بن کر آ

میں ہر اِک دہر پہ اثر چھوڑ آیا
اثر نہ ہوا تو دہر چھوڑ آیا

مسئلہ یہ تھا دل اگر چھوڑ آیا
میں کافر کے ہی ہاتھ پر چھوڑ آیا

جہنم کی مجھ کو ہوا کیوں نہ لگتی
میرا جد ہی جب اپنا گھر چھوڑ آیا

نہ احسان ہو جاں طلب محسنوں کا
اسی خوف سے میں شہر چھوڑ آیا

جدھر کھیل میں تھے محو چند بچے
لڑکپن میں اپنا اُدھر چھوڑ آیا

ہے دنیا میں ہر سمت بکھری نزاکت
کہیں دل ، کہیں پہ جگر چھوڑ آیا

ہے دم اپنا اپنا عدم اپنا اپنا
یہاں ہر کسی کو ہے ہے غم اپنا اپنا
نہیں کوئی تقلید اب خود سری ہے
سبھی کا ہے نقشِ قدم اپنا اپنا
کہاں کوئی بندہ کہاں بندگی ہے
مگر چاہتے ہیں حرم اپنا اپنا
ہر اِک دل کا اپنا الگ فلسفہ ہے
صنم، دین ، دوزخ، اِرم اپنا اپنا
ہے راحت فقط اِک گھڑی بزم سے پھر
سبھی لے کے چل دینگے غم اپنا اپنا
فدؔا کس مُصنّف کی تصنیف کیا ہے
فہم اپنی اپنی قلم اپنا اپنا

روح رہ جائے گی پھر بھی گروہ جاں لے جائے گا
ہر طرف دامن اُسی کا ہے کہاں لے جائے گا
عشق کے چولہے پہ جس دل کو لگی چتی یہاں
پوٹلی میں حسرتوں کا وہ دھواں لے جائے گا
توڑ کر میرا قلم غصے کو وہ ٹھنڈا کرے
روک لوں تو کاٹ کر میری زباں لے جائے گا
جب سمندر کو نہیں کر پائے گا میرے خلاف
تو سفینے کا ہی میرے بادباں لے جائے گا

مت کرو صحرا میں خواہش تم ہوائے سرد کی
مست سا جھونکا کوئی یہ سائباں لے جائے گا
آپسی جھگڑوں میں اُلجھے بھول کر اُردو زباں
پھر کوئی انگریز یہ ہندوستاں لے جائے گا
میں نے سیکھا ہے یہی مختار زاہدؔ سے فداؔ
"میرے حصے کا وہ کیسے آسماں لے جائے گا"

حقیقتوں کے شہر میں وہ خواب بیچتا رہا
حدودِ ریگزار میں سراب بیچتا رہا

امیرِ حُسن نے تو گھر بسا لیا کنارے پہ
غریب دل گلی میں گُم کباب بیچتا رہا

وہ نام پانے کے لئے خریدتا ہے شاعری
میں گھر چلانے کے لئے کتاب بیچتا رہا

وہ ایک گُھڑ سوار تھا جو بُورِ اسپ کے لئے
قلیل نرخ باندھ کے رکاب بیچتا رہا

دکان پر نقاب کی شگاف سے عضوِ زن
کی کر کے نمائشیں وہ نقاب بیچتا رہا

پڑھائی کے لئے لُٹا اثاثہ نوجوان کا
فدا وہ رزق کے لئے شراب بیچتا رہا

بھول کر راہِ طریقت خود اِرادی ہو گیا
اور شریعت چھوڑ کر مسلم جہادی ہوگیا
دور ہوکر اپنے مذہب سے رہا جب نام کا
اپنے حق کی بات کرکے وہ فسادی ہوگیا
عالمی حلقوں میں وحدت اپنی کھو کر ڈھونڈلی
سر زمیں اپنی تو پھر الگاؤ وادی ہوگیا
کیوں ہوا اتنا تغیّر کہ مسلماں کا طریق
مُنصفانہ عام تھا اور اب جلادی ہوگیا
علم کے سانچے میں دوزخ اور اِرم ڈھلنے لگا
یوں عبادت کا سلیقہ بھی مُرادی ہوگیا
حشر میں کوئی کسی کے ساتھ کیا ہوگا فدؔا
جب اسی دنیا میں آدم انفرادی ہو گیا

آپ کو ہم مفلسی میں اپنے گھر لائینگے کیا
اور اگر لانا بھی چاہیں آپ آجائینگے کیا
فقرہِ غالبؔ بہ ہجرت سوئے کوئے دلنشیں
''ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا''
مصرعہ اقبالؔ شعرأ کی صدارت پر بجا
''ووٹ تو مل جائینگے پیسے بھی دلوائینگے کیا''
پھر وہ لے آئے نظریہ تنگ سُننے کو مجھے
آج بھی میری زبان سے خود کو بہلائینگے کیا
صبحدم گنگا کے لب پہ پنڈتوں کی ذات پات
صاف جسموں کو کرینگے دل کو نہلائینگے کیا
دہر میں سنگیت کی ہر کوئی شاعر ہے فداؔ
کس کو دیں ترجیح اب آشوب ہے گائیں گے کیا

مورت جیسی عادت رکھنا
صورت پہ تم دعوت رکھنا
حاجت کے لقمے سے زیادہ
دولت سے نہ رغبت رکھنا
حکمت ہے گنجان شہر میں
تُربت اپنے بابت رکھنا
سبقت ہم عصروں سے لے کر
جدّت سے تم سنگت رکھنا
خجلت کے سب چہرے دھونا
زینت کی اِک صنعت رکھنا
صنعت میں نُدرت ہے اُس کی
وحدت ہو کر کثرت رکھنا

حمد

نظیری کا کوئی سامان کر تمثیل میں یارب
کبھی مثلِ مفصّل آ میری تفصیل میں یارب

ستاروں کو بدلنے کی کوئی سکّت نہیں مجھ میں
کہ ہے یہ کارخانہ ہی تیری تحویل میں یارب

اذیّت جھیلنے کی ہے مجھے تم کو بنانے کی
کوئی پتھر ہی لاتے قلب کی تشکیل میں یارب

بقا میری میرا آغاز اور انجام ہے تجھ سے
تسلسُل نبض تک کا ہے تیری تعمیل میں یارب

میں ہوں تقدیر کا مارا ہوا آدم کبھی تو دے
جبیں کے ہر نوشتے کو میری تحصیل میں یارب

کبھی ناری، کبھی نوری، کبھی خود سا کبھی تُجھ سا
بجُز شرمندگی کے کچھ نہیں تاویل میں یارب

فقیری کا ذہن پہ راج ہے اب
گدا ہوں سر پہ لیکن تاج ہے اب

حقیقت سے کرو آئینہ سازی
تصوّر دید کا محتاج ہے اب

بٹا کشتِ ازل کا ایک دانہ
وہی ناسوت کا سر تاج ہے اب

صدا ہوں بازگشتِ دشتِ گل میں
مسلسل گردشوں میں لاج ہے اب

بدن تھا نفس کی خوشحال بستی
سکونِ قلب سے تاراج ہے اب

فداؔ مسجد میں بھی وضعِ عروسی
کہاں مومن کی وہ معراج ہے اب

سرائے گل سے گزر گئے سب
اس آئینے میں اُتر گئے سب
رہا نہیں کوئی اہلِ دل تو
کہو کہ بستی میں مر گئے سب
دکھا جو آئینۂ حقیقت
نشے ذہن سے اُتر گئے سب
ہوئی تمہاری ہی جیت واعظ
عذابِ دوزخ سے ڈر گئے سب
غزل کی وادی میں ہے کثافت
یہیں پہ شاعر ٹھہر گئے سب
فدؔا غزل کا خلل پڑا تو
سکوں کے شام و سحر گئے سب

ہوئے زر کی خواہش میں احباب غائب
ہے مخمل کا بستر مگر خواب غائب
تعلق یہی جسم اور روح کا ہے
ڈھکن کھول دو اور سیماب غائب
حقیقت کے آگے بناوٹ ہے کیا شئے
سحر کی ضیا میں ہے مہتاب غائب
بڑھاپا ہے ذہنی تقاضوں سے خالی
پرانے مکاں سے ہے اسباب غائب
پڑھاتا غزل میری جو اہلِ فن کو
رِسالے سے ہے بس وہی باب غائب
فداؔ یہ زمانہ ہے دھڑکن بنا دل
ہے رُستمؔ کے قصّے سے سہرابؔ غائب

اس بار میری آرزو کو اختیار سونپ
ویرانیٔ صحرائے ہستی کو بہار سونپ
یا وصل کے امکان پہ کر لے عہد شکنی
رکھ لے تو ناز اور مجھ کو انتظار سونپ
میں یہ نہیں کہتا کہ مجھ پہ ہی کرم فرما
لے سوز کی نعمت کسی کو بھی قرار سونپ
نے عیب جوئی نے خوشامد پہ ہوں میں مائل
میرے ہُنر کو اک نگہہِ آئینہ دار سونپ
گر ہو فدا اِک حسن جس میں بُردباری ہو
حامِل کو بے سوچے دلِ اُلفت شعار سونپ

طاغوت در تابوت ہے ، تابوت در طاغوت
اپنی حقیقت کا خلل بن کر ہُوا ناسوت
دل جب فلک کی وسعتوں سے جا ملا کوئی
خود کو اِرادت میں دیا تو پالیا ملکوت
جب حال وارد ہوگیا تو پالیا انعام
مومن ہوا قدرت ملی اور چھو لیا جبروت
سود و زیاں سے بے نیازی کی جگہ وحدت
تابع عوامل ہوگئے تو کیفیت لاہوت
ہے بے خبر خود سے خودی سے اور ہونے سے
فاروقؔ اس بے کیفیت کا نام ہے ہاہوت

آساں نہیں ہے زندگی آسائشیں بہت
چیزوں کی ہے بہتات اور فہمائشیں بہت

اس دور میں انسان کا ہی قافیہ ہے تنگ
نسلی سگ و گربہ کی ہیں افزائشیں بہت

صحرائے بے کاری میں ہیں مثلِ سراب وہ
روزی کے صیغوں میں ہیں جو گنجائشیں بہت

سنجیدگی کے شعر اب کوئی نہیں سنتا
لیکن لطیفوں کے لئے فرمائشیں بہت

لالچ ، حسد، رنجش ، تکبُر ، جھوٹ اوردغا
آدم کی ذات میں ہوئیں آلائشیں بہت

ہر شئے حقیقت سے لگے خالی مجھے فدؔا
ہیں وصف ہی نایاب اور زیبائشیں بہت

یقیں تو نہیں کہ شہر ہے سلامت
ضمانت ہے کیا کوئی گھر ہے سلامت

تیری شان مولا کہ مظلوم کا در
اُجڑ کے بھی ظالم کا سر ہے سلامت

سکوں کے پرندے اُڑے شہر سے اب
غمِ نان پہ جاں کا ڈر سلامت

مبارک ہو سب کو کہ آدم ابھی تک
دھماکوں کے انبار پر ہے سلامت

مریخ و قمر پہ سکونت نہیں ہے
زمیں کا تبھی بحر و بر ہے سلامت

غزل کو مکمّل فدؔا آج کر لوں
کہ اب تک سخن کی بحر ہے سلامت

زردی ہے سچّی اور چہرے کا نکھار جھوٹ
اس شہر میں ہر شخص کے سر پر سوار جھوٹ

سچ کی سُرخروئی کا قصہ اب نہیں چلتا
اس دور میں ہونے لگا ہے دل کے پار جھوٹ

میں کس طرح کرلوں بھروسہ تیرے وعدے کا
اِک بار جھوٹ، دو بار جھوٹ پھر بار بار جھوٹ

اس شہر کے لوگوں کا جانے کیا ہو مستقبل
گنتی کی ہیں سچائیاں اور بے شمار جھوٹ

اردو ادب سچ کے لپیٹے میں ہے جھوٹی بات
'دوبیل'' جھوٹ ''گوٗدان'' جھوٹ ''باغ و بہار'' جھوٹ

سچائی اب ہاری ہوئی اک بات ہے فدؔا
ہوتا ہے یاں پہ کامیاب اب بار بار جھوٹ

بنیے کے سینے میں چھپے سِر کھولتے ہیں باٹ
میزان سچائی کے ہیں سچ بولتے ہیں باٹ

جب مدعا کھو جائے دل کا ڈولنا حق ہے
بازار اُٹھ جائے تو رَہ پہ ڈولتے ہیں باٹ

بیوپار میں پڑتا ہے جن کو بھی خسارہ وہ
شک کی نگہہ سے دیکھ کر پھر تولتے ہیں باٹ

ذاتِ الٰہی کو فقط معبود جتلا کر
عاقل کو محشر کے لئے بس رولتے ہیں باٹ

ہر اِک جا ہر اِک راہ پہ جا بجا چیخ
ہے مشغول ہر اِک دہر اور مچا چیخ
میرے دور کی بندگی بھی عجب ہے
ہے مسجد میں آشوب برپا خدا چیخ
سُنا ہے کہ آدم کی آمد سے پہلے
زمیں تھی نہ زر تھا نہ زن تھی نہ تھا چیخ
ہماری دعا بے اثر اس لئے ہے
نظر میں حسد، بات دشنہ ، ادا چیخ
جبھی شب نے پھیلا دی تاریک چادر
تو ٹھنڈے چراغوں کا بُجھنے لگا چیخ
فؔدا بے تعلق مزاجی پہ لعنت
میرے گھر کی دہلیز پہ آ گا چیخ

وطن کی ہے اگر پہچان سرحد
لڑائی بے وجہ ، امکان سرحد
چھپائے جنگ کا سامان سرحد
ہے لاشوں کا بھی قبرستان سرحد
اگر دو بھائیوں کے بیچ اُبھرے
بنائے ہند و پاکستان سرحد
لگا دونوں طرف دونوں طرف کو
عجب خطرے پہ ہے حیران سرحد
بٹے ہیں باڑھ سے جذبات ورنہ
محبت سے نہیں انجان سرحد
فدا انسان کو دے کر تحفظ
کرے انسان کو قربان سرحد

رات کے بے نوُر چہرے پہ عیاں ہے چاند
شب کے تنہا راہرو کا راز داں ہے چاند
ہے زماں کا دخل قدرت کے کرشموں میں
ہر مہینہ عید کو لاتا کہاں ہے چاند
رات بھر توحید کا تسبیح خواں ہے چاند
بے زباں ہے صوفیوں کا ہم گماں ہے چاند
خوبصورت شام کا اِس سے تصور ہے
اور سہانی رات کا دلکش سماں ہے چاند
گول آئینے میں گر ہے روشنی بھرپور
سرد خطوں کے لئے تو نیم جاں ہے چاند
حسن کا پیکر ہے ٹھنڈی روشنی کے ساتھ
شب کی خاموشی کا حامی بے زباں ہے چاند

کلچرل اکادمی کے نام

راستے کی کھال پیروں سے اُتر جانے کے بعد
نام چھاپے گا مگر قسمت سنور جانے کے بعد

ہے ثقافت گھر میرے کشمیر کا اعلیٰ بہت
حوصلہ افزائی کرہی لے گا مرجانے کے بعد

ٹاک صاحب کا تعاوُن ہے مگر کس کام کا
فنڈ دفتر میں نہیں عرصہ گزر جانے کے بعد

حوصلہ شکنی ہے ہر چہرے پہ غازے کی طرح
بے ادب کہلاؤ گے ادّبا کے گھر جانے کے بعد

آگئی تصنیف 'شیرازہ' میں تو پھر فخر سے
نیل آرم ہوگئے ہم چاند پر جانے کے بعد

ان حسیں چہروں کے پیچھے اور چہرے تو نہیں
ہم نیا چہرہ لگا دیں گے شہر جانے کے بعد

خود روی میں خودسری سے بے ثمر ہوا ہے جھُنڈ
بستگئ نورِ حق سے بارور ہوا ہے جھُنڈ
خون ہو گیا ہے بِکاؤ پُر خطر ہوا ہے جھُنڈ
ڈھونڈ ڈھانڈ لگ گئی تو مختصر ہوا ہے جُھنڈ
وقت وقت پہ اُسی کی جان پہ گزر گئی
جس اکیلی شخصیت سے معتبر ہوا ہے جھُنڈ
غیریت کے بیج اُگ پڑے ہیں سبزہ زار میں
یوں تو ابلہِ خدا و ایشور ہو گیا ہے جھُنڈ
لاغری کی زد میں ہوگیا نحس قدم فدا
اور چر بیا کے جاذبِ نظر ہوا ہے جھُنڈ

دھو دھو کے پی لیا ہے بارہا کہ یہاں تک
تعویز ہو گیا ہے تیرے نام کا کاغذ

مدت گزر گئی ہے تیری دید سے پرے
آنکھوں پہ رکھ لیا تیرے پیغام کا کاغذ

بزم سخن میں داد نے دامن سبھی بھرے
آنکھیں تلاشتی رہی انعام کا کاغذ

خوددار شاعر کی تو بہت مغفرت ہوئی
ردّی میں بک گیا مگر کلام کا کاغذ

ہاتھوں میں قلم آکے رک نہ پائے پھر فدؔا
تصویر ہی تیری ہے میرے کام کا کاغذ

عرش کی اور فرش کی تسخیر پہ اُس کی نظر
اِک شرارہ جو حُباب آسا ہوا محوِ سفر
وہ حُبابِ آب رنگی عرف جس کا آسمان
نے جُدا اُس سے کواکب نے قمر نے بحر و بر
رنگ و نسل و مذہب و ملت کا پھندا کٹ گیا
نورِ حق کی روشنی گوہر میں ہے کچھ تیز تر
عقل کی ہے مملکت خاشاک و خس یہ رنگ و بو
خاک و خوں کی وسعتوں سے ماورا دل کا شہر

نام روپی قید سے جو منتقل حیرت میں ہو
کیا کہے کیسے کہے وہ کیا اِدھر ہے کیا اُدھر

کون کس کا ہے؟ کہو یاں کون کس کا ہے نہیں
اک مہر کی سب شعائیں اک شجر کے سب ثمر

عشق کی تفصیل میں بے عشق کیسے دے سکوں
کچھ سکوں کچھ بے سکونی کچھ تھپک کچھ نیشتر

وہ جگہ شہباز کی پرواز کا آغاز ہے
جس جگہ قمری و بلبل کے جلے سب بال و پر

لفظ سے فاروقؔ معنی کا ہوا کب حق ادا
گوشۂ خاموش کا طالب ہے دانا بہر بہر

وہی بوئے فطرت وہ نغمۂ جاں پھر
میں آدم کی ہوں ایک صورت عیاں پھر
سکونت اِرم کی نہ راس آئی مجھ کو
نہ دنیا میں آتا تو جاتا کہاں پھر؟
سبق لے نہ پایا میں ہر بار ڈوبا
ہوائیں وہی پھر ، وہی بادباں پھر
وہی دل کہ آتش زدہ جھونپڑے سا
وہی آرزؤں سے اُٹھتا دھواں پھر
وہی آدمی اور وہ روٹی کا جھگڑا
وہی خوں کی ہولی وہی داستاں پھر
فؔدا دُرست کر لے فقط ایک سجدہ
عبادت ہے کیا اور کیا ہے اذاں پھر

میرے سر پہ احسان آجائے تو پھر
وہ گھر آج مہمان آجائے تو پھر

وہ خوش ہیں میں اُن کے ستم بھولتا ہوں
کبھی مجھ کو میزان آجائے تو پھر

کتابی ہے صورت تری اور جبیں پر
میرا عشق عنوان آجائے تو پھر

تیرے بام سے گُل فشانی کا ڈر ہے
کبھی سر پہ گُلدان آجائے تو پھر

میرے شعر سے تم شہر چھوڑ دو گے
کبھی میرا دیوان آجائے تو پھر

فدؔا دردِدل تو ہے اُلفت کا حاصل
جو عاشق کو پہچان آجائے تو پھر

کرے نہ کچھ کام کاج شاعر
گھٹائے گھر کا اناج شاعر
قلم کو بیچے تو کھائے روٹی
بدل نہ پائے سماج شاعر
کبھی تھا دربار کا چُنندہ
تو بوجھ گھر پہ ہے آج شاعر
نئی زمیں کی غزل کہاں ہے
کہاں سے لے اب مزاج شاعر
رہی نہ بے کار اب کوئی شئے
ادب کو ہے اِک خراج شاعر
ہے نیم شب کو فتورِ فرہنگ
علیل شاعر، علاج شاعر

میرے شہر کو اِک بیابان کہہ کر
فقیر اِک چلا سب کو مہمان کہہ کر

نظر میں مری ہے جو اونچا ہمالہ
ڈھلا آفتاب اُس کو میدان کہہ کر

کیا علم نے جونہی امکاں کو ثابت
حقیقت ٹلی خود کو امکان کہہ کر

مرَے خونریزی میں دونوں ہی دشمن
میں اللہ کہہ کر وہ بھگوان ہوکر

سمجھتا ہے مسلم بھی خود کو متقی
کسی غیر مسلم کو شیطان کہہ کر

فؔدا ہم کو چُن چُن کے مارا کسی نے
عراق اور افغان و ایران کہہ کر

آجاتے ہیں وہ بزم میں بنتا ہے سماں اور
جل جاتی ہے جاں اور بھی اُٹھتا ہے دھواں اور

قابل نہیں بہشت کے دوزخ ہی لے چلو
یہ مُشت خاک چھوڑ کے جائیں گے کہاں اور

ہر لمحہ تو بڑھتی رہی آلام کی شدت
فضلِ خدا، ہم کو ملا ہے تاب و تواں اور

سبقت پہ پھر سبقت تو ہم لیتے رہے مگر
رہ پہ ہمیں ملتے رہے قدموں کے نشاں اور

رکھی ہے مشق شعرِ ہم نے بھی سنبھال کر
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا تھا انداز بیاں اور

چہرے بدلنے کا وہی اِک کھیل پھر
رنجش بھرے دل اور زباں پہ میل پھر

پھر سے وہی اِک ہندو پاک بات چیت
اِک سرحدوں کے پار جاتی ریل پھر

مغرب نے چوس کر جو اُگلا ہے معاش
تِل سے نکالا جا رہا ہے تیل پھر

فہرست پہ پھر پڑ گیا ثروت کا بوجھ
بالا کی جانب ہے قطار ذیل پھر

پھر رائے عامہ کا ہوا کاغذ کفن
اپنے نِصاب میں وطن ہے فیل پھر

بُت تراشی کا ہے جوہر اور پہاڑ
چاہتا ہے شوقِ آذر اور پہاڑ

طور کا قصّہ نہ میں سمجھا کبھی
نورِ اللہ اور پیمبر اور پہاڑ

پھر بحث کی کیا ہے گنجائش اگر
روبرو ہو جائیں پتھر اور پہاڑ

چاہتے ہیں سب کہ چھوڑیں چوم کر
سنگ ہیں بھاری بہت، گھر اور پہاڑ

زندگی آلام کا انبار ہے
روز ٹکراتے ہیں یہ سر اور پہاڑ

ہو تیری پرواز کیسے معتبر
اِک تو مرغی کے تیرے پر اور پہاڑ

چمن میں مادیت کا غُل ہے اور بے حال بُلبُل بس
جہانِ رنگ و بو امکان کا ہے اک تسلسل بس

خودی کے آئینے میں خود نمائی ہو چکی اُس کی
قیامت تک فقط جاری ہے اب اُس کا تامّل بس

نظر کثرت کے پردے سے اگر پرواز کر لے تو
نمایاں چہرہ انوار کا بکھرا ہے کاکُل بس

کٹائے سر کوئی ایماں کی خاطر اب کہاں ممکن
عبادت بھی معاشی زندگانی کا تعطُّل بس

سمندر سے کوئی لے آئے موتی دم کہاں سے لے
مری حاجت کو تیرے آستاں کا ہے توسّل بس

خیالِ یار کی رعنائی کر لیتی ہے کام اپنا
طبیعت بھی میری فاروقؔ رکھتی ہے تغزّل بس

مقدّر کے آگے ہے انسان بے بس
پرائے مکاں میں ہے مہمان بے بس
خودی کی نسیں بال بچوں نے کاٹی
اُٹھانے لگے سب کے احسان بے بس
گرہستی سے دیدی گئی جوت ہم کو
محبت کا بھرتے ہیں تاوان بے بس
حکومت ہے اندھیر نگری میں لاغر
ہیں قانون مختار و انسان بے بس
جگہ لی ہے جذبات کی مادیت نے
فدؔا ہے بشر آج میکان بے بس

اِک خامہ، اِک بیاض بصورت کتاب بس
میری مکمل زندگی اِک اِنتساب بس
جھکتی ہوئی گردن تیری دیکھی نہیں جاتی
اے نوجوان قوم بس اے انقلاب بس
میری سخن گوئی فداؔ کچھ بھی نہیں لیکن
ہستی کے ہر پہلو کا ہے اِک احتساب بس

خوش نما جلوہ لئے اِک حسن کی تصویر کاش
ہاتھ میں آجائے میرے اور کھُلے تقدیر کاش

چند لفظوں سے بھرا کاغذ تمنا کا کفن
بول اُٹھے روبرو تیرے میری تحریر کاش

دل کے آئینے سے یہ زنگارِ دنیا صاف ہو
اُن کی آمد میں ذرا سی اور ہو تاخیر کاش

جنگ سے پہلے فقیرِ عشق نے مانگی دعا
ہاتھ میں آکر نکل جائے دمِ شمشیر کاش

ہیں تکلف اور مروت میں بندھے یہ دست و پا
بات آجائے لبوں پہ اور کھُلے زنجیر کاش

دل کے صحرا میں فدؔا فصلِ گلِ اُلفت کھلے
نام ہو جائے میرے یہ حسن کی جاگیر کاش

روز و شب کے درمیاں اِک کشمکش
مرگ و ہستی جسم و جاں اِک کشمکش

ذہن کے پردے پہ رقصاں خواہشیں
یوں رگوں میں ہے رواں اِک کشمکش

نُدرتِ فکر و عمل میں ہے سکون
وحشتِ سود و زیاں اِک کشمکش

اختر و شمس و قمر میں ہے کشش
ہے زمین و آسماں اک کشمکش

حُسن پہ کیوں عشق نہ بگڑے فدا
واں سکونِ قلب ہے یاں کشمکش

دیوار و در سہمے ہوئے ہر اِک مکاں خاموش
محوِ سفر ہر کوئی پل اور کارواں خاموش
ہر صبح کی دہلیز پہ مقتل ہے ظُلمت کا
ہر شام کے سائے میں ہے اِک داستاں خاموش
یاں زندگی پلتی ہے افعی خُو فضاؤں میں
ہر آنکھ نابینا سی ہے اور ہر زباں خاموش
لٹکی ہوئی صورت فدا ہر اِک نظارے کی
بے نور سا چہرا لئے ہے آسماں خاموش

دل خاک الفت سے ہوا اور جان بالخصوص
آتش زدہ گھر میں جلا سامان بالخصوص

ہر شکل ہے جھریوں بھری، دورانِ گردش سے
پیکر میں ڈھلتے ہیں نئے عنوان بالخصوص

ٹوٹا ہوا ہر آئینہ سنگیں شہر میں تھا
بکھرے ملے ہر راہ پہ پیمان بالخصوص

وہ شہر جس میں آدمیّت کی روایت تھی
اُس شہر میں بِکتے ہیں اب ایمان بالخصوص

دل اور جگر میرے شناساؤں میں بٹ گئے
مہماں طلب کرتے ہیں میری جان بالخصوص

دشمن کے طعنوں کے سوا ہر شئے کھٹکتی ہے
رنجور کرتے ہیں فدؔا احسان بالخصوص

شاعر تو ہو نہ پائے کبھی ہم مگر بیاض
معمول کی چوکھٹ پہ ہے اِک بے اثر بیاض

سج دھج کے آئے بزم میں اور شعر نہ کہا
سب نے کہا کہ کھا گئے ہیں بیچ کر بیاض

فکرِ معاش آنکھ کو سونے نہیں دیتی
گردان میں رہتا ہے لیکن رات بھر بیاض

کاغذ پہ اُگ آتی ہے فصل اِک حروف کی
خامے کے آنسوؤں سے جو ہوتا ہے تر بیاض

اس عمدگی کو کیا کہوں، 'خاموش معلم'
سکھلا رہا ہے مجھ کو شعر کا ہُنر بیاض

ہر شئے سے ہم کو ہے فدؔا عزیز تر بیاض
اپنی تو شام ہے بیاض اور سحر بیاض

سمٹتے بکھرتے بحور اور ارض
مگر پھر سنورتے بحور اور ارض

ہر اِک لمحہ شیشے میں دوران کے
رضا سے اُترتے بحور اور ارض

عہد زندگانی کی تشکیل کا
وفا روز کرتے بحور اور ارض

خلاؤں کی وسعت میں جُنبش بنا
ادا سے گزرتے بحور اور ارض

توانا ہے ننھا سا جوہر بہت
تباہی سے ڈرتے بحور اور ارض

محو ہیں کشا کش میں ہر پل فدا
ہیں جُڑتے کُترتے بحور اور ارض

ہر اِک ذہن پہ مادیّت کا تسلط
ہے بر خُلق سی کیفیت کا تسلط

سیاست پہ چڑھنے لگا رنگ دین کا
ریاست پہ ہے قومیت کا تسلط

بھروسہ نہیں اب کسی پہ کسی کو
ہے بیمار اِک ذہنیت کا تسلط

رواجوں کے ہمراہ قدریں مِٹی ہیں
ہوا گاؤں پہ شہریت کا تسلط

خودی جو بشر کو خدا سے ملائے
ہے خود کی نفی ماہیت کا تسلط

فدآ ہے یہی تو تقاضائے فطرت
رہا ہے سدا فوقیت کا تسلط

تدبیر تھی موزوں مگر نقش قدم غلط
کرتے رہے ہم بارہا اپنے ہی غم غلط
امید ہم کو عاقبت کی اُس خدا سے ہے
لیتے رہے ہیں عمر بھر جس کی قسم غلط
تصنیف اب کوئی کہاں ہے قوم کی رہبر
مضموں غلط، انشاء غلط اس پہ فہم غلط
سجدہ تیرا تسکین سے خالی ہوا ہے کیوں
ہے تو غلط، مولا غلط یا پھر حرم غلط

ہر اِک صبح طالع ، ہر اِک شام طالع
ہے آغاز تدبیر و انجام طالع
اثاثہ میں یہ لے کے جنت سے آیا
جنم، موت، گندم کا الزام ، طالع
ہے مُطلق شعوری اگر کار فرما
رضا کا ہے اک اور بھی نام ، طالع
سمیٹوں میں ہر اک خوشی زندگی کی
جو آجائے اک پل میرے کام طالع
ہر اِک زندگی میں فؔدا موت کی بُو
کوئی موت ہستی کا پیغام، طالع

نہیں ہے خطرِ امکانی سے فارغ
کہاں کوئی پریشانی سے فارغ

ہر اِک پل کا بسیرا جدّتی ہے
کرے بس موت حیرانی سے فارغ

مکاں کو بیچ کر بدلی سکونت
ہوئے ہر دن کی مہمانی سے فارغ

ہمیں بھی خانگی کی بیڑیوں نے
کیا جذبوں کی طغیانی سے فارغ

اکیلے ہیں جو غاروں ، جنگلوں میں
وہی ہیں نفسِ انسانی سے فارغ

فدؔا ہم علم کا احسان رکھ کر
ہوئے ہیں دشمنِ جانی سے فارغ

حقیقت رنگ و بو کی ہے مکاں حادث مکیں مطلق
حدودِ قلب کا ہے آسماں مطلق، زمیں مطلق

بصارت کے لئے کافی ہے آتش، باد، آب وِ گل
بصیرت کی لطافت کو کُھلا ہے ہر کہیں مطلق

مقدر سے نہ کر شکوہ، تمہاری عقل ہے جزوی
ہے عالم کار فرما تُجھ پہ بس مہلک نہیں مطلق

مکان و وقت کے اُس پار ہے اِک حال بے گفتہ
تجاوُز لوٹ جائے تو اماں مطلق امیں مطلق

نظر میں طُمطراق اور ذہن میں طُمطراق
غریب سوچ اور رہن سہن میں طُمطراق

بدن کو ڈھانکنے کا مدعا ہے آب آب
جدید آدمی کے پیرہن میں طُمطراق

قناعتوں کے دم پہ ہے غریب زندگی
امیر شخص کے کفن دفن میں طُمطراق

نصیحتوں کا بوجھ پڑ رہا ہے طِفل پر
شریک ہے طریقِ مرد و زن میں طُمطراق

گُلاب لب سے ہوگیا ہے خوش وضع کلام
لفاظیت سے آگیا سخن میں طُمطراق

ہو یورپی غلام کس طرح سے نوجوان؟
بڑھا دیا ہے اب میرے وطن میں طُمطراق

باتیں گڑھنے والے لوگ
یونہی لڑنے والے لوگ
آگے بڑھتے لوگوں کے
پیچھے پڑنے والے لوگ
لالچ، کینہ رکھتے تھے
قبر میں سڑنے والے لوگ
اشکوں کی کیا قیمت دیں
موتی جڑنے والے لوگ
چہرے تو پڑھ پاتے نہیں
خبریں پڑھنے والے لوگ
ثروت کی رفتار سے ہیں
آگے بڑھنے والے لوگ

خوف کے سائے میں پلتے ہیں سارے لوگ
کھانا پینا بھول گئے بیچارے لوگ

روٹی کا پیچھا کرتے ہیں سارا دن
راتوں کو گنتے رہتے ہیں تارے لوگ

راحت کے اسباب بڑھے اور کام گھٹا
اپنے ہی اصراف بڑھا کر ہارے لوگ

رشوت کے پیسوں پہ چھینا چھپٹی ہے
پہلو میں رکھ لیتے ہیں انگارے لوگ

اونچائی پہ جانے سے ڈر لگتا ہے
پھر بھی تکتے رہتے ہیں مینارے لوگ

میری بستی میں جلسوں کا موسم ہے
فرحت آگئیں زعماء اور دکھیارے لوگ

میرے نفَس کا آبگینہ میرا دل
مگر بیش قیمت نگینہ میرا دل
ذرا سے سکوں کے لئے جاں فشانی
میری خواہشوں کا پسینہ میرا دل
غمِ روزگار و غمِ عشق یکجا
ہے گرداب میں اِک سفینہ میرا دل
کبھی گُل کھلاتی ہیں اس کی بہاریں
کبھی بادلوں کا مہینہ میرا دل
ہے دھڑکن سے پائل کی جھنکار جاری
خراماں حسینہ میرا دل
خدائی کی تصدیق کا دل ہے مرکز
سفر کا فدا میرا زینہ میرا دل

اے طائرِ بے حس کبھی اُڑنے کے پر نکال
اس دامِ ناپختہ کے ہر حلقے سے سر نکال
تو مہر ہے ابرِ سیہ کو چیر کے رکھدے
اور ظلم کے افلاک سے حق کی سحر نکال
ہے لعل تو اُس کی ہر اِک جا پہ ہے منزلت
اُس کو درونِ ارض سے چاہے جدھر نکال
ہونی کسی حیلے سے ٹل جائے نہیں ممکن
تو زندگی سے موت کے غم کا زہر نکال
دنیا پہ حاوی ہے فدؔا آتش تمنا کی
اس آگ کے حلقے سے امیدوں کا گھر نکال

نمایاں نورِ ازّل کی حسیں رعنائیاں ہیں ہم
مگر دہلیزِ دنیا کی طرف پرچھائیاں ہیں ہم

وہ جس کے ہم گمان وہم بیان وہم زبان ہیں ہم
ہمارے درمیاں ہے وہ اُسی کے درمیاں ہیں ہم

خدائی کا ہے بکھرا شش جہات اظہار آئینہ
ہم ہی کلمہ ہم ہی سجدہ ہم ہی مسجد اذاں ہیں ہم

ہے جنّت ایک کاندھے پہ جہنم دوسری جانب
محمدؐ کا ہے دل عکاس تو پھر حکمراں ہیں ہم

گزرتے ہیں اسی سے ہم یہ خود ہم سے گزرتا ہے
جہانِ رنگ و بو کے ہم مکیں ہیں اور مکاں ہیں ہم

ہے آب و خاک و باد ونار اپنی فہم کا محور
ہے ایسی ایک وہ گل بھی جدھر سے آسماں ہیں ہم

جو کثرت میں بٹیں ہم تو ذرا سی آبجوئیں ہیں
ڈھلیں وحدت میں گر فاروقؔ بحرِ بیکراں ہیں ہم

شیشے کی خُو لے آئے پتھر کے دیار ہم
اس شہر میں ہیں کس قدر بے گانہ وار ہم
کیوں بے سبب حق کے بنے آئینہ دار ہم
پھرتے ہیں تیرے شہر میں بے روزگار ہم
مثلِ متاعِ بے بہا رنگیں سکونت کے
حلقے میں ہیں لیکن نہیں ہوتے شمار ہم
ہر سمت سے پاتے ہیں بس اپنی ہی بازگشت
صحرائے لق و دق میں ہیں تنہا پکار ہم
دونوں ہی جانب آگئی سر پر فدا آتش
واں ہے صنم کو بے دلی یاں بے قرار ہم

کہانیوں کی کتاب میں گُم
ہوئی ہے سچائی خواب میں گُم

طفولیت کا پسند چہرہ
جواں ہوا اور نقاب میں گُم

گلاب کاغذ میں گم ہیں ایسے
حسین منظر سراب میں گُم

چھلک پڑی جب نگاہ ساقی
ہوئے ہیں ساغر شراب میں گُم

حباب کو گُم کرے سمندر
ابھی ہوا ہے حباب میں گُم

ہیں ذائقے کے ہزار پہلو
بس ایک میٹھے ثواب میں گُم

اگر تم ہو کہاں ہوں میں اگر میں ہوں کہاں ہو تم؟
جو دونوں ہیں تو پھر کیوں ہوں عیاں میں اور نہاں ہو تم
حقیقت ہے یہ میری، کہ سمندر تم جہازی تم
مجھے تم نے اُتارا ناوَ تیری بادباں ہو تم
لئے پھرتا ہوں تیرے شہر میں تیرا اثاثہ میں
مجھے لُٹنے کا خطرہ تم سے ہے اور پاسباں ہو تم
بہت کم فاصلہ ہے درمیاں اس آشنائی کے
میں تیرا منتخب پرتوَ ، میرا حرفِ اذاں ہو تم
سعی کتنی بھی کرلوں تم تلک کیسے پہنچ پاؤں
قدیم و بے نموں و بے چگون و بے بیاں ہو تم
تمہیں کیا نام دوں تم کس طرح کتنے کہاں پر ہو
زماں کی نبض ہو تم ہو زمیں اور آسماں ہو تم

بارہا غم سے اُبھر کر پھر بکھر جاتے ہیں ہم
کیا خبر آتے کہاں سے ہیں کدھر جاتے ہیں ہم
ہر گھڑی اُلفت کے شیشے میں اُتر جاتے ہیں ہم
سامنے ہر خوبصورت کے ٹھہر جاتے ہیں ہم
گر تصّور میں اُبھر آئے سراپا اے خدا
نقش مژگاں صنم چُبھتے ہی مر جاتے ہیں ہم
کون کیسا تھا کہاں کس نے کہا کیا، کیا خبر
دن بہ دن کتنی ہی شکلوں سے گزر جاتے ہیں ہم
یار سے ہیں آشنائی توڑنے کے عہد بند
خواب میں لیکن فدؔا کچھ اور کر جاتے ہیں ہم

قلندر وقت سے ہٹ کر الگ انداز رکھتے ہیں
یہ شاہیں خاک میں رہ کر دم پرواز رکھتے ہیں
پڑھا ہے نام کا کلمہ کہاں اعجاز رکھتے ہیں
مسلماں بے ہُنر ہونے کا اب اعزاز رکھتے ہیں
محبت کا ہے اِک لمحہ ہزاروں سال سے بہتر
ہمیں انجام کا غم کیوں ہو ہم آغاز رکھتے ہیں
عجب ہی ڈھنگ سے اُلفت کی چٹّی لگ گئی دل کو
نہ ہی ہم شوق رکھتے ہیں نہ ہی ہم ناز رکھتے ہیں

زمینِ ہند بھی چستیؒ تماشا بن گئی ہے اب
دلِ بے سوز پہ صوفی دہر میں ساز رکھتے ہیں

نہ ڈالیں سُبحہ و زُنار کا پھندا گلے میں ہم
تو کیسے مان لے کوئی کہ ہم بھی راز رکھتے ہیں

ہماری حیثیت کا جب کہ چرچا عام ہے فاروقؔ
تو ہم بھی یاد کیا رکھیں کہ اِک ہم راز رکھتے ہیں

سلامت ہے دل تو سلامت زباں
نہیں تو ہے مثلِ قیامت زباں
اذاں ہے زباں اور اقامت زباں
بتاتی ہے آدم کا قامت زباں
صفوں میں ہیں دندانِ مرشد کھڑے
کیئے جا رہی ہے امامت زباں
ہوئے ''قُم بِاذِنی'' سے مُردے کھڑے
میرے غوثؒ کی ہے کرامت زباں
انا الحق کہا زندہ منصورؒ نے
جسد کی تو لے آئی شامت زباں
خدائی کی شاہد ہے پیغمبری
مگر جبرئیلی علامت زباں
ہو فاروقؔ جاری اگر ضربِ **لا**
کرے ماسِوا کی حجامت زباں

بگولے آکے مٹی کے اِجارے خوب لیتے ہیں
نظر والے بھی دنیا کے نظارے خوب لیتے ہیں

ذرا مٹی ، ذرا پانی، ذرا سی باد اور آتش
مجھے آئینہ کرنے کو سہارے خوب لیتے ہیں

تمناؤں کی ڈُلہن ہے سجی دنیا کی محفل میں
ارادے مانگ بھرنے کو ستارے خوب لیتے ہیں

مچل جائے جو دنیا میں تو دل کو دوش مت دینا
یہ میلہ ہے یہاں بچے پٹارے خوب لیتے ہیں

میرے درویش لے آتے ہیں انجم کو کرایے پر
عمل خالی ہیں اور قسمت کے مارے خوب لیتے ہیں

یہی علم الیقیں کے دور کا آغاز ہے فاروقؔ
محقق تو نہیں قرآں کے پارے خوب لیتے ہیں

دل تو ہے سینے میں نورِ دل نہیں
جسم ہے لاشہ حضورِ دل نہیں

آنکھ کو اقلیمِ حادث کی طلب
منطقی حس ہے شعورِ دل نہیں

شجرِ حق کس طرح سے ہو لب کُشا
عقل کا موسیٰ ہے طورِ دل نہیں

جب کہ لذت آشنا ہیں سب حواس
بد مزاجی ہے سرورِ دل نہیں

دل ازل سے ہے سلوکی راہرو
نفسِ امّارہ فتورِ دل نہیں

دل کو دلبر سے ہی ملتی ہے کُشاد
بے محبت کو صبورِ دل نہیں

رشتہ و پیوند و زر فاروقؔ سب
بارِ دنیا ہے امورِ دل نہیں

حق رسیدہ نہ اسلاف دیدہ ہوں میں
کس طرح بول دوں کہ برگزیدہ ہوں میں

کفر اور دین کے بیچ کی بات ہوں
ڈگمگاتا ہوا اِک عقیدہ ہوں میں

اپنی صورت سے ہوں اِک کھلا مرثیہ
اور سیرت سے اپنا قصیدہ ہوں میں

ہیں بہت نکتہ چیں میرے تعداد میں
جیسے کوئی اُبھرتا جریدہ ہوں میں

سانس لینے نہ دے کوئی تسکین کا
زندگی سے بہت ہی کشیدہ ہوں میں

ہوں غزل کے ہُنر سے فؔدا بے خبر
گر تخیل کے پہلو سے چیدہ ہوں میں

تیری یاد نے گر سُلایا ہمیں
تیرے شوق نے پھر جگایا ہمیں
کبھی حسبِ موقع ہو اظہار دل
یہی اِک سلیقہ نہ آیا ہمیں
بغل میں بہت خواہشیں ڈال دیں
خدائی نے کتنا ستایا ہمیں
خدا بھی پریشان ہوا دیکھ کر
وجودِ نقائص جو پایا ہمیں
مخالف کا فن داد کا مستحق
ہمارا سخن خود سُنایا ہمیں
فدؔا ہیں طرحی غزل کے کرم
تقی میرؔ سے بھی ملایا ہمیں

میری نکتہ چیں ہر زباں ہے یقیناً
جہاں دل وہاں داستاں ہے یقیناً
جہاں پر پڑا میرا ٹھوکر سے ماتھا
کفِ پا کا تیرے نشاں ہے یقیناً
میرا راز یونہی نہاں تو نہیں ہے
نہاں اِک میرا رازداں ہے یقیناً
نزاکت تیری جب کہ ہے روز افزوں
میری بھی تمنا جواں ہے یقیناً
مجھے خوف ہے کہ میرے پاسباں سے
ہلاکت کے سائے میں جاں ہے یقیناً

ہمارے ہاتھ سے قدرت نے کیا جوہر دکھائے ہیں
جو نقطے خود نہیں سمجھے وہ اوروں کو سکھائے ہیں

اُجالے کی سحر لانا نہیں ہر ایک کے بس میں
فلک پہ رات نے یوں تو کئی سورج اُگائے ہیں

حقائق کے سمندر. میں دھلے سب رنگ ہستی کے
سحر کی روشنی نے نیند سے سپنے بھگائے ہیں

تقدس اُن کے چہروں کا بیاں کرتا ہے آئینہ
یہاں کردار جو اشکِ ندامت سے نہائے ہیں

بڑی مشکل سے آیا عشق کے جذبات پہ قابو
یہ بچے رات کے پچھلے پہر ہم نے سُلائے ہیں

فدؔا کیسے بیاں کر لوں میں اپنے شہر کا قصہ
یہاں اہلِ وفا نے کس طرح آنسو چھپائے ہیں

ہے دور تو عالمگیری کا ، سرحد کی کہانی کہتے ہیں
یورپ کے لوگ تو ایسی فہموں کو نادانی کہتے ہیں

بازار پہ چھایا رہتا ہے بیرونی اشیاء کا موسم
ہم لوگ معاشی غلبہ ہونے کو ارزانی کہتے ہیں

محدود ذہانت کے بل پر ہر شئے کا خلاصہ کرتے ہیں
ہم علم کے پیرائے لے کر باتیں امکانی کہتے ہیں

اس شہر میں لوگوں کے گھر کیا تسکین سے دل بھی خالی ہیں
بے مطلب راہ پہ بہہ جائے تو خون کو پانی کہتے ہیں

اُن کی بھی اپنی بندِش ہے اپنا بھی الگ سا شیوہ ہے
ہم لوگ حقیقت لکھتے ہیں وہ نافرمانی کہتے ہیں

سرحد پہ تنازعہ جاری ہے نادار سپاہی کٹتے ہیں
اس پار کی بھینٹ کے معنی میں وہ بھی قربانی کہتے ہیں

کئی دن سے دلبر اُلجھتے نہیں ہیں
مسائل بھی اپنے سُلجھتے نہیں ہیں

دھماکوں کی اب شہر کو لت پڑی ہے
یہاں ڈھول خلقت میں بجتے نہیں ہیں

زمانہ ہے آنسو بھری آنکھ کا اب
کہیں گُل گریباں پہ سجتے نہیں ہیں

زمیں ہوگئی جبکہ جاذب لہو کی
تو ابرِ کرم یاں گرجتے نہیں ہیں

سخنور وہی یاں پہ مقبول تر ہیں
جو اپنا کہا خود سمجھتے نہیں ہیں

وہ شمشیر گر تولتے ہیں ہر اک پل
قلم کو فدا ہم بھی تجتے نہیں ہیں

جدھر دیکھتا ہوں جہاں دیکھتا ہوں
لہو بار اِک آسمان دیکھتا ہوں
کہیں محل کا ایک دھندلا نظارہ
کہیں ہر نگہ سے دھواں دیکھتا ہوں
کبھی آنکھ میں اَشک امریکیوں کے
کبھی دل میں افغاں فغاں دیکھتا ہوں
کہیں خون میں تر ایک لاشوں کا منظر
کہیں بم سے اُڑتے مکاں دیکھتا ہوں
تصور میں میں اُن کی آمد کے صدقے
بہاروں کا دلکش سماں دیکھتا ہوں
فداؔ دل میں شاعر اُبھر آئے جب بھی
میں غالبؔ کا طرزِ بیاں دیکھتا ہوں

کال ہوئی موصول بنا ہے آج کا دن ہڑتال کا دن
ہر دن مالا مال کا دن ہے آج کریں کنگال کا دن
دورِ تقابل میں ہے کس کو فرصت کہنے سُننے کی
لیکن ہے ہڑتال کا دن شہمت کے استقبال کا دن
ہتھ گولے اور آنسو گیس چلیں کنکر کی بارش میں
بیچ شہر کے لوگ حراساں اور باہر بھونچال کا دن
خون بہے تو لاشوں سے ہو پورا موت کا ریچارج
ورنہ رگڑا رگڑی سے ہے قدرت کی مِس کال کا دن
ٹوٹی پھوٹی ہے ہر شئے اور سڑکیں ہیں سُنسان بہت
گاؤں والے جھیل رہے ہیں قصبے میں جنجال کا دن
سرکاری نوکر کے گھر میں چُھٹی کا تہوار تو ہے
محنت کش کا حرفِ تاسف 'ہائے وہ روٹی دال کا دن'

مقامِ غیر ہے زیبا کلام کرتے ہیں
خیالِ یار میں سب کو سلام کرتے ہیں

جہاں پہ آئینہ ہو جائے آدمی کا بدن
وہاں پہ رام کو بھی رام رام کرتے ہیں

پڑھے ہوں لاکھ ہوش کے سبق مگر ساقی
بس اِک نگاہ میں قصّہ تمام کرتے ہیں

لہو جلاتے ہیں شب کو چراغِ اُلفت کے
یہی اندھیروں کو ہم پہ حرام کرتے ہیں

زماں سے ہوگئی رفتار تیز تر جن کی
وہی تو صبح و شام کو غلام کرتے ہیں

صفات ہا کو ہماری نہ دیکھتے ہیں فدؔا
ذرا سے عیب کا چرچا وہ عام کرتے ہیں

آؤ ہر اِک رسم دنیا کی نبھانی ہے تمہیں
زندگی ہر روز ہر شب سے چرانی ہے ہمیں

اِک عجب ہی ڈھنگ کے نیلام سے گزرو گے تم
خود ہی بِکنا ہے تو خود بولی لگانی ہے تمہیں

علم کتنا ہو تجرُبہ کس قدر ہو حسن کا
چوٹ پہ پھر چوٹ اور پھر چوٹ کھانی ہے تمہیں

آئینہ بوڑھا جو ہوگا رنگ سب جل جائینگے
داستاں پریوں کو تتلی کی سنانی ہے ہمیں

طفلگی لے آئے گی خوشیوں کی دُلہن بیاہ کر
مانگ خود اُس کی بڑھاپے میں مٹانی ہے تمہیں

رنگ و بو کے پار اپنی ذات کو کر لے تلاش
سانس لینے کی فدؔا قیمت چکانی ہے تمہیں

خاک کے ذرے سے بے حد نور افشانی نہ ہو
شمس کا دعویٰ کرے اتنی درخشانی نہ ہو

آدمی کا طور حیواں کو سکھانا ٹھیک ہے
آدمی کو کیوں نہ سکھلائیں کہ حیوانی نہ ہو

آج کا ہر قیس بے کاری کا ہے مارا ہوا
ڈر ہے کہ لیلیٰ کہیں دولت کی دیوانی نہ ہو

شہر میں میرے کوئی بھی آدمی ایسا نہیں
جس کے دل میں خوف نہ ہو آنکھ میں پانی نہ ہو

کیوں زمینیں تنگ ہوتی جائیں آدم کے لئے
پار کشمیری نہ ہو اس سمت مُلتانی نہ ہو

اب خیالوں میں فدؔا وہ شہر بستے ہیں جہاں
آدمی سے آدمی کی خانہ ویرانی نہ ہو

ہیں چہرے پہ بکھرے سیہہ فام گیسو
جبیں پُر سحر ہے کھُلی شام گیسو
سر صبح گیسو سرِ شام گیسو
تیرے آئینے کا فقط کام گیسو
ہر اِک زُلف میں آب چک کی ہے کثرت
کہ موتی کریں مفت نیلام گیسو
تبھی کوئے جاناں ہے جائے حوادث
سُکھاتے ہیں جب وہ لبِ بام گیسو
خلش ہے فدا حُسن منظر سے اُن کو
سلجھتے نہیں مثلِ آلام گیسو

نظر لگ گئی شہر کے نوجواں کو
کہ پتھر اُچھالے ہے اپنے مکاں کو
نہ کھانے کے لالے پڑیں یاں تو کیا ہو
بچانے لگے ہیں سبھی اپنی جاں کو
کتابوں کے کاٹے سوالوں کی بقچی
لئے ساتھ طلباء چلے امتحان کو
زمیں بوس ہے اب تھکا وہ پرندہ
جو چھونے چلا تھا کبھی آسماں کو
میرے نیم جاں شعر میں ڈھونڈتے ہیں
وہ اقبالؔ و غالبؔ کے طرزِ بیاں کو
فداؔ راز کو فاش کر دوں ، اگر ہو
پریشاں کروں کیوں کسی رازداں کو

اگر چشمِ بینا ہو بے نور کیوں ہو
شہر میں اندھیرے کا دستور کیوں ہو
چھبے مثلِ سوزن، کرے خون دل کا
وہ منظر نگاہوں کو منظور کیوں ہو
صحن میں بھی ہو خوف کیوں راہزن کا
کوئی اپنے ہی گھر میں محصور کیوں ہو
ملے داد زر کو ، کہے زر، سُنے زر
سخن ور یہاں کوئی مشہور کیوں ہو
رہے خاص آزاد اور عام پابند
یہی میری بستی کا منشور کیوں ہو
مسئلہ فؔدا اب مصائب کا یہ ہے
کہیں پہ کوئی شخص مسرور کیوں ہو

خون ہو لیکن لال نہ ہو ، تو؟
دل ہو جیب میں مال نہ ہو ، تو؟
میاں بیوی سے ہو راضی
گھر میں آٹا دال نہ ہو، تو؟
آئینے کو دھمکا کر بھی
سیب کے جیسا گال نہ ہو تو؟
چاند کے جیسی صورت تو ہو
سر پہ کوئی بال نہ ہو تو؟
گیت کو نہلا کر گا لینا
پانی میں سُر تال نہ ہو تو؟
دعوت پہ بھی ناک جو بگڑے
جیب میں پھر رومال نہ ہو تو؟

کندھے پہ تیر دان، دست میں کمان رکھ
جینے کا شوق ہو تو ہتھیلی پہ جان رکھ

بے شک تو اپنے قد سے بھی اونچی اُڑان رکھ
خاکی سمجھ خود کو نظر میں آسمان رکھ

دریائے ہستی ہے رواں تیرے سہارے پہ
ڈھلتی ہے عمر تو طبیعت کو جوان رکھ

جس کا تیرے اسباب کو خطرہ لگا رہے
اُس شخص کو اپنے مکان کا پاسبان رکھ

اِک عالمی ہوا چلی ہے سرحدوں کے پار
صندوق میں یہ نقشۂ ہندوستان رکھ

حسرت میں نہ ڈھل جائے تیری آرزو فدؔا
سینے میں دل ہے تیرے تو منہ میں زبان رکھ

گھر کا اندر باہر پیسہ
بیوی بچہ شوہر پیسہ

صدقہ خرچہ بخشش رشوت
بدلے کتنے تیور پیشہ

بے دردی سے باپ کے آگے
بولے آنکھ اُٹھا کر پیسہ

رشتوں کے آئینے اندھے
اپنے پن کا جوہر پیسہ

تاج محل کا منظر دلکش
پیار کا سنگِ مر مر پیسہ

دنیا ملک ریاست ضلع
گاؤں ، محلّہ اور گھر پیسہ

واجبی تمثیل ہے یہ زندگی
عشق با تکمیل ہے یہ زندگی

شوق آئینہ طلب ہو ہی گیا
حکم کی تعمیل ہے یہ زندگی

رنگ و بُو کی وسعتوں میں ہے عدم
ہیچ کی تحویل ہے یہ زندگی

دل اگر دنیا ہے دھڑکن روز و شب
چاہ کی تفصیل ہے یہ زندگی

بے محبت کا جسد مُردار ہے
حُب سے بے تبدیل ہے یہ زندگی

ہر طرف جس کے محمدؐ ہے لکھا
حیَ کا سنگِ میل ہے یہ زندگی

ذات میں فاروقؔ بے کل تھے صفات
جُملہ ہا تنزیل ہے یہ زندگی

کہر آلودہ سی شب میں تمہاری دید ہو جاتی
وہیں پر سجدہ کر لیتے ہماری عید ہو جاتی
نہ لفظوں کے سمندر میں نہا لیتے تو ہم کیا تھے
تیری تصویرِ انشاء کی اگر تمہید ہو جاتی
نگارِ بیش دانش گرچہ سودائی نہ کر لیتے
تو ہم میں صد ہُنر صد عیب کی تولید ہو جاتی
کہاں کی شاعری اُس کو غنیمت جان لیتے ہم
کہیں ہم سے بھی غالبؔ کی اگر تقلید ہو جاتی
نہ ہی اخبار کی سرخی سے آتی موت کی دھمکی
نہ اپنی رائے کی خود سے یہاں تردید ہو جاتی
فداؔ ہم پارساؤں کی بلندی تک گئے ہوتے
کسی کی عیب جوئی گر کہیں تنقید ہو جاتی

لہو موجود ہونے کی بدن سے بُو نہیں آتی
مگر اے شاعری اے فصل اوسر تُو نہیں آتی

کراؤ طفلگی میں ہی متعارف اپنے بچوں کو
نہ ہو دل میں بسی اُردو تو پھر اُردو نہیں آتی

مَلو ہر پنکھڑی پہ ساتھ رنگوں کا بنا غازہ
مگر کاغذ کے پھولوں سے کبھی خوشبو نہیں آتی

بہت لکھنا تھا تیرے گیسوؤں کی تابداری پر
مگر قابو میں میرے اُلجھنِ گیسو نہیں آتی

گماں کو اپنے میں نازُک خیالی کس طرح مانوں
قلم کو جب کہ میرے شاعری یکسو نہیں آتی

اگر شعر و ادب سے جی چُرا لیتے ہیں درباری
فدؔا اب شعر سے بھی لذّت کا جُو نہیں آتی

روش ہوگئی بے اثر توڑ ڈالی
قسم ہی بوقتِ سحر توڑ ڈالی
میری مے پرستی بھی کچی لڑی ہے
بہت مرتبہ جوڑ کر توڑ ڈالی
امیں ہوگیا میرے گھر کا لُٹیرا
جو خود اپنی زنجیرِ در توڑ ڈالی
دھڑکتی ہوئی آرزو سے بھری شئے
ہماری تھی اُس نے مگر توڑ ڈالی
عجب ہی نظارہ دِکھا پختگی کا
ثمر نے ہی شاخِ شجر توڑ ڈالی
تصور کے ہم بھی فدؔا تھے سخنور
حقائق نے ہر اک بحر توڑ ڈالی

میرے ہونے نہ ہونے میں نہ تھا کچھ بھی مگر پھر بھی
کیا تخلیق اک بے پایہ بے قیمت بشر پھر بھی

صبا کی پُشت پر تاروں بھری وسعت میں ہو آیا
مگر اِک قلب کی گہرائیوں سے بے خبر پھر بھی

دھماکوں کی صدا سے گونجتی ہے یہ زمیں ہر پل
قلم کی نیم بِسمل آہِ شب ہے بے اثر پھر بھی

اُسی کے چھت سے بارش گر کے میری چھت پہ پڑتی ہے
پڑوسی نے کیا ہے نظر آتش میرا گھر پھر بھی

ہماری دوستی کا بج رہا ہے شہر میں ڈنکا
میرا دل آبلہ پھر بھی تیری ضد نیشتر پھر بھی

رگ رگ میں ہے اُترا پانی
ہر اِک چوٹ سے رِستا پانی
نیند کو آنکھ مچولی سوجھی
گھر کی چھت سے ٹپکا پانی
پانی پانی تھا یہ حُلیہ
کھڑکی نے جب اُگلا پانی
فیس بنا کب آئے گھر میں
دولت کا ہے پیاسا پانی
بہتی ہے اب اُلٹی گنگا
خون ہے سستا مہنگا پانی
تیرا بادہ زمزم جیسا
احمر سا ہے میرا پانی

نگاہِ ناز پُر انداز جب میخانہ بنتی ہے
عروجِ حال سے ہر چشمِ نم رندانہ بنتی ہے

اکیلی ذات کی تقسیم کاری کا ثمر کثرت
وجودوں کی طرف دنیا فقط بُتخانہ بنتی ہے

وطن کی راہ میں سالک جمالِ حسن سے جوگزرے
یہ رنگ و بُو کی دنیا آن میں ویرانہ بنتی ہے

تعلق سے منازل طے ہوئے معراج کے یکدم
اِرادت ہو تو پل بھر کی لگن یارانہ بنتی ہے

فرشتہ جس جگہ آدم کے اِک سجدے کا منکر ہو
وہاں پہ عمر بھر کی بندگی حرجانہ بنتی ہے

اگر پرہیزِ آب و گِل سے نکلے ترک کا مطلب
بجائے حُب طریقت اک وضع رہبانہ بنتی ہے

جو اِک اشک ندامت صبح گاہی میں چھلک آئے
نمی اُس کی بقائے ذات کا پیمانہ بنتی ہے

جسد کا ہو تغیّر قلب کے حالات نہ بدلیں
وہی اک موت تو حیات میں مردانہ بنتی ہے

کچھ ایسی لااُبالی عشق میں فاروق ہے پیہم
کسی کی سادہ لوحی پُر لطف افسانہ بنتی ہے

خودیٔ لانہایت کے لئے امکاں میں امکاں ہے
خودیِٔ جُز تعیّن کا ثمر میزاں پہ میزاں ہے
رہے تصدیق میں گر دل تو ہے اقرار بھی نعمت
نہیں تو آب و گل کا دل لئے ہر ایک حیواں ہے
زبان و وقت کا پابند ہے قرآں نہیں فرقاں
عجم کا آدمی کم تر سہی لیکن مسلماں ہے
قلندر کو نہیں ہے زندگی اور موت سے مطلب
نظر جس سمت جاتی ہے فقط محشر کا میداں ہے
زبردستی عبادت ڈال دوں معبود کے آگے؟
نہ ایما ہے نہ شوقِ وصل اور نہ قلبِ انساں ہے
لگا دی مولوی نے ہاٹ جس کے علم کی فاروقؔ
وہ ہے خیر البشر ہر آدمی پہ اُس کا احساں ہے

دروں میں جھانک کر پیدا کبھی سوز جگر کر دے
کبھی آنکھوں کو آنسوئے ندامت سے بھی تر کر دے
رہے کب تک تو آب و دانہ کی آوارگی میں گُم
تو اپنی زندگانی فقر کی شہہ پر بسر کر دے
اسی دل کی تو کر تعمیر جو حرم الٰہی ہو
سبق وہ دے خرد کو جو خرد کو بے خبر کر دے
مسافر بن کے طے کر لے منازل زندگانی کے
تو اپنے نفس دل کو ہُو کی گرمی سے گُہر کر دے

نہ شیطاں کی طرح ہو جائے منکر سجدۂ حق کا
شہادت ذات کی بس آب و ِگل کے ثقل پر کر دے

زماں کے جوہری کے ہاتھ میں دے ہاتھ کو اپنے
وجودِ مِس کو جو نظرِ کرم سے سیم و زر کر دے

خودیٔ عقلِ جُز کو ڈال دے تو پائے مرشد میں
خودیٔ عقلِ کُل میں ڈوب کر خود کو امر کر دے

اگر تُجھ کو ملے شمشیر اِلااللہ فقیروں کی
صنم خانے کو پھر فاروقؔ تو زیر و زبر کر دے

مجھے معلوم کیا اس رنگ و بُو کی کیا حقیقت ہے
نبوت وصفِ صورت ہے تو صورت مغزِ وحدت ہے
نہیں ہے عقل جُز کو عشق اور معشوق سے نسبت
کہ دل کی مملکت میں سوزِ پیہم کی ضرورت ہے
احد، احمد، محمد کی حیاتی جلوہ افروزی
میرے مشہودِ ازل کی یہی ظاہر شہادت ہے
کرے لاچار مجھ کو ثقل ممکن کی گرفتاری
وگرنہ ذات اپنی حیثیت میں لا نہایت ہے

نہ رستے کی خبر نہ ہے منازل کی شناسائی

دیارِ یار میں اک سات منزل کی عمارت ہے

لُٹا دی ذکر کی پونجی یہاں جھوٹے فقیروں نے

فقط تعویز کا چرچا ہے کاغذ کی تجارت ہے

اگر فاروقؔ مشکل بحر سے موتی کا لانا ہے

تو ایسی سوچ کا رکھنا ہی مرشد کی عنایت ہے

فقط آئینہ داری ہے نشانی ایک ہی تو ہے
مفصّل رنگ و بو لیکن کہانی ایک ہی تو ہے
یہ پیکر میں ڈھلی کثرت بجُز اُس کے مجسم ہے
سبب شش سمت ارضی آسماں ایک ہی تو ہے
وہی آدم سے ہے اوّل وہی ہے حشر سے آخر
ہے ظاہر یخ نما باطن کا پانی ایک ہی تو ہے
زباں میں جبرئیلی دم بیاں میں ذات کا پرتو
نہ اُترے لفظ میں نہ کوئی ثانی، ایک ہی تو ہے

کوئی شئے ذاتِ احمدؐ کے رجوع سے ہے کہاں خارج
قیامت بھی اگر کبریٰ ہو فانی ایک ہی تو ہے

وہی خطبہ جو ہے کوہِ صفا سے آج تک جاری
حقیقت کے چمن کی گُل فشانی ایک ہی تو ہے

تسلسل زندگانی کی حقیقت ہے اگر فاروقؔ
گماں اندر گماں جاری ، روانی ایک ہی تو ہے

کس نے کہا فقرُت کی شہہ سے گھر اُلٹتا ہے
صوتِ قلندری ہو تو منبر اُلٹتا ہے

ساقی کے لطف سے جواں ہے بزمِ اہتمام
بے کیف ہو سبو تو پھر ساغر اُلٹتا ہے

کاری اگر ہو دل پہ ضرب شکلِ یکتا کی
بسمل کا ہفت قُلزم و پیکر اُلٹتا ہے

تصدیق کی رہ پر تُو وا کر چشمِ دل اپنی
قبلہ صحیح ہو جائے تو خاور اُلٹتا ہے

پرواز کی لذّت سے ہے شہباز آشنا
قمری کے حلقے میں پڑے تو پَر اُلٹتا ہے

منَ میں حواس گر نہ مل پائیں تو شب حرام
بے کل سرور اس لئے بسترِ اُلٹتا ہے

قالب ہی قلب ہے کہا ہے میرؔ نے لیکن
فاروقؔ دل کی پرورش میں سر اُلٹتا ہے

منزل نہ پوچھ رہگزر کے دل میں جھانک لے

وہ آنکھ لے جو ہر نظر کے دل میں جھانک لے

اِک پیاس وہ جو ہونٹ کے پیمانے سے چھلکے

اِک پیاس وہ کہ جو بحر کے دل میں جھانک لے

اِک وہ خودی کہ جُز کے تعیُن میں گرفتار

اک وہ خودی کہ کُل سپہر کے دل میں جھانک لے

اک قول وہ محدود جو ادراک تک ہی ہے

اک قول وہ ہے جو بشر کے دل میں جھانک لے

اک خواب وہ جو رات کی تعبیر سے تاریک
اک خواب وہ کہ جو سحر کے دل میں جھانک لے
اک قلب وہ کہ آب و گِل کی زد میں ہے مردہ
اک وہ ہے جو آئینہ گر کے دل میں جھانک لے
اک وہ قدم جو ہے زیاں اور سوُد کا فاروقؔ
اک وہ قدم ہے جو سفر کے دل میں جھانک لے

دوئی گُمراہ کرتی ہے ذہن جب خام ہوتا ہے
نظر کے واسطے ہر شئے میں اک پیغام ہوتا ہے

رموزِ حق میں علمیِ مُدرقہ ناکام ہوتا ہے
جہاں عین الیقین ہے بس وہیں الہام ہوتا ہے

بسے خود میں خدا تو قلب کعبے سے نہیں ہے کم
دُھلے جب میل دل کا جسم خود احرام ہوتا ہے

یہ کیسا عشق ہے جو اسم سے ہے بن مسمیٰ کے
تصوّر بن نہیں پاتا لبوں پہ نام ہوتا ہے

کتابوں کے اصولوں سے حقیقت دور ملتی ہے
برائی کا یہاں پہ کب بُرا انجام ہوتا ہے

مِرا بھی وِرد ہے اللہ مُشرک شہر میں فاروق
بغل میں ہے چھُرا میرے بھی منہ میں رام ہوتا ہے

میری وادی میں یوں فنکار کا انجام ہوتا ہے
کسی کا کام ہوتا ہے کسی کا نام ہوتا ہے
میری وادی کا فن یورپ کے فن سے کم نہیں لیکن
وہاں پہ عام ہوتا ہے یہاں گُمنام ہوتا ہے
حقارت کی نظر سے دیکھ لو یورپ کے شہروں کو
ہمارے شہر میں کب آدمی نیلام ہوتا ہے
فِضائیں تاک میں رہتی ہیں منظر خوف سے لرزاں
جہاں چادر اُترتی ہے بدن نیلام ہوتا ہے
مجھے مذہب کا کیا غم ہو سیاست چھوڑ دی میں نے
لہو آدم کا پینے سے مجھے آرام ہوتا ہے
سکوتِ شب یہ لفظوں کا تناسُب اور میں فاروقؔ
سُخن ور کے مقدر میں کہاں آرام ہوتا ہے

کس قدر مہنگے اُجالے پڑ گئے
رُخ تمناؤں کے کالے پڑ گئے

ہوگئیں خون ریز دل کی وادیاں
بستیوں کے لب پہ تالے پڑ گئے

بے حیائی کی چلی ایسی ہوا
نرگسی آنکھوں پہ ہالے پڑ گئے

شہر سے انسانیت عنقا ہوئی
ڈھونڈتی آنکھوں میں چھالے پڑ گئے

جب سے رغبت شاعری سے ہوگئی
خوردنی اشیاء کے لالے پڑ گئے

پھاڑ دینگے شاعری اپنی فدا
سامنے تنقید والے پڑگئے

بند پلکوں کی گلی میں یار میرا ہے تو ہے
خواب کی حالت میں دل ہشیار میرا ہے تو ہے

گاؤں کے اِک جھونپڑے کا ہوں چراغِ آرزو
شہر کی رونق سے دل بیزار میرا ہے تو ہے

غم کی دنیا میں لطیفوں کی تجارت ہے میری
دل جلوں کے ساتھ کاروبار میرا ہے تو ہے

حسرتوں کی بے بسی کی اور تھکن کی سلوٹیں
میرے بستر پر بہت ہی بار میرا ہے تو ہے

مسکراہٹ ، دردمندی، خوش کلامی اور مزاح
راہ چلتے بھی کھُلا بازار میرا ہے تو ہے

عیب جُو گر ہیں فدا وہ خاکساری کے میری
فصل ناوک بھی دلوں کے پار میرا ہے تو ہے

مصوِّر رنگ و بُوئے خوبیٔ شہکار میں گُم ہے
گُماں کی رفعت و تکمیل کے دیدار میں گُم ہے
کہو مردود سے باغِ الٰہ کا ترجماں ہے گل
خودیٔ جُز تمہارے ذات کے اقرار میں گُم ہے
کہا نانکؔ نے بھی 'اول ہے اللہ' حق نمائی میں
یہ کس ہستی کی صورت اب تیرے دستار میں گُم ہے
وہی 'شیو لنگ' جو ممکن بنا ہے آبِ واجب سے
کوئی شئے تو مکان و وقت کی رفتار میں گُم ہے

کہا عیسیٰؑ نے ''والد ہے خدا صورت کا' حق تو ہے
یہاں سیرت سے مریم پاک کیوں تکرار میں گم ہے
بُدھی لاما کی بُدھ ناسوت سے مہجورِ خاطر کیوں؟
ایذا دیتا ہے خود کو دین کے اسرار میں گُم ہے
میرا واعظ خبر دیتا ہے وہ شاہد نہیں جس کا
جہادِ نفس سے باہر ہے اور تلوار میں گُم ہے
میرا صوفی بھی ہادیؑ کا منافق ہوگیا فاروقؔ
یہ ٹِکسالی دکھاوا عِلم کے بیوپار میں گُم ہے

کہاں سے قلب لوں جو جلوۂ انوار میں گُم ہے
میرا بھی حال اوروں کی طرح بے کار میں گُم ہے
طلب اُس پار کی دل کو کہاں بس ہچکچاہٹ ہے
پکارے ناخدا کو عقل اور اِس پار میں گُم ہے
اذاں کی یہ بلندی ہے تو پھر پستی کیا یارو
نہیں دل پہ ہے اس کی ضرب یہ مینار میں گُم ہے
زباں سے کہہ دیا اللہ اکبر تو زباں کِس کی
حقیقت سے خرد خالی ہے اور آثار میں گُم ہے

سیاسی، اقتصادی، سائنسی پہلو ہیں اسلامی
ہے مُسلم یار کے کوچے میں اور اغیار میں گُم ہے
مجھے مسلم کی اُس اِک کیفیت پہ رشک آتا ہے
شہادت میں نفی خود کی ہے اور ایثار میں گُم ہے
کرے اقبالؔ کے مکتب میں اب گھُس بیٹھ کرگس بھی
اُڑان کی بات بے جالب پہ اور مُردار میں گُم ہے
سلیمی میرؔ کی حائل ہوئی میری ہلاکت میں
وہی فاروقؔ اس وضعِ نوِ اشعار میں گُم ہے
اگر جمہور کی کھائی ہے یاں، واں اشتمالی چاہ
عرب افراط و تفریطِ زرِ دینار میں گُم ہے

حال سراسر پتھر کا ہے
خوف ہے کیا گھر پتھر کا ہے

راہوں کے تو بیٹھ گئے دل
منظر منظر پتھر کا ہے

دھول جمی ہے خواب کے در پر
آنکھ میں کھنڈر پتھر کا ہے

گود میں ہے دستار سبھی کی
خوف کہ سر پر پتھر کا ہے

وادی ہے میری موسم موسم
آج یہاں پر پتھر کا ہے

موم ہے میری قوم جگر سے
اور مقدّر پتھر کا ہے

شیشہ شیشہ دھول چٹائے
شوق میں آزر پتھر کا ہے

پسینہ اوس کا آئے، فِضا نمکین ہو جائے
سحر ہو بس تغزُل کی غزل رنگین ہو جائے

خدا، فردوس کا منظر لئے ہوں بند یہ آنکھیں
رضا سے رنگ نکھرے آہ بھی یاسین ہو جائے

عمل پہ میں نہیں غمگین نہ ہی کچھ خوف دوزخ کا
مجھے ہے فکر یاروں میں نہ کچھ توہین ہو جائے

حقیقی عشق سے محبوب کا ہے عکس شیشے میں
مزا ہے گرچہ اس میں آدمی بے دین ہو جائے

کتابی شکل میں اُبھرے سحر انگیز اِک دانش
میرے بکھرے خیالوں کی اگر تدوین ہو جائے

فداؔ یک طرفہ ہے میری محبت کاش ایسا ہو
طلب جس کی ہے وہ خود بھی میرا شوقین ہو جائے

قلم پہ نیا زور پڑنے لگا ہے
فراست بھرا غور پڑنے لگا ہے

کہیں پاس میں ہے وہ محشر کا میداں
مرے کان میں شور پڑنے لگا ہے

وہ سایوں کا پہلا گھنا پن کہاں ہے
اُجالا بھی کمزور پڑنے لگا ہے

زمانے کا میزان اُلٹے پہ اُلٹا
یہاں چور پہ مور پڑنے لگا ہے

فسانوں نے پکڑی سواروں کی باگیں
ہر اِک اسپ منہ زور پڑنے لگا ہے

غزل نے صفائی میری دی تو فاروقؔ
گڑھے میں چغل خور پڑنے لگا ہے

جذبہ و حِس کے شرارے کھو گئے
آدمیت کے نظارے کھو گئے

بوتلوں میں صاف پانی آگیا
بے وضو ہوکر کنارے کھو گئے

فلسفہ بردار ہر دانش ہوئی
علم کے سچے ادارے کھو گئے

جھوٹ کے پر بھی لگے اور پاؤں بھی
یوں حقیقت کے سہارے کھو گئے

کھڑکیوں پہ بد گماں پردے پڑے
یوں پڑوسی کے اشارے کھو گئے

گھر پہ بجلی کے کرشمے چھائے تو
شب کے زیبائی ستارے کھو گئے

رات کی تاریک گلیوں میں فداؔ
حرف شعروں کے بچارے کھو گئے

بھٹکتی شئے گزرتے کارواں میں آہی جاتی ہے
نئی سی بات کوئی داستاں میں آہی جاتی ہے

یہ سوچا تھا کبھی نہ ذکر ہو اُن کی نزاکت کا
مگر ہر بار وہ میرے بیاں میں آہی جاتی ہے

ہزاروں پارچوں سے پردہ داری کر دریچوں کی
فِضاؤں سے کرن کوئی مکاں میں آہی جاتی ہے

ہڑّپہ کا دبا گھر ہو کہ ہو اہرام کا کھنڈر
زبان کی روح پھر رازِ نہاں میں آہی جاتی ہے

وہی گندم کا دانہ باز رہنا تھا مجھے جس سے
اسی کی خاص لذّت پھر گماں میں آہی جاتی ہے

فؔدا حد سے گزر جاتی ہے جب ظلمات کی وسعت
ضیا مثلِ تبسُم آسماں میں آہی جاتی ہے

شعر لکھتا ہے وہ اونچا نام پانے کے لئے
میں نے بھی غزلیں لکھی ہیں گُنگُنانے کے لئے

وہ لئے پھرتا ہے اک چہرہ تقدس میں ڈھلا
میں بھی تو رکھتا ہوں اِک چہرا چھپانے کے لئے

آدمی کی کب بڑھی قیمت مگر افراط زر
اب نہیں کٹتی ہے گردن چار آنے کے لئے

آفتیں معمول ہیں، آتی ہے لیکن عید بھی
مفلسوں کے گھر میں بچوں کو رُلانے کے لئے

ہستی موہوم میں میری دوامی ڈھل گئی
مصلحت نہ ہوسکی گندم کے دانے کے لئے

مادیت کے دور میں فاروقؔ فرصت ہے کِسے
راستے پہ اِک پڑا موتی اُٹھانے کے لئے

نہ فن سے ہے رغبت نہ ہی گلبدن سے
بگڑتا ہوں خود اپنے دیوانے پن سے
کفِ دست میں میرے خنجر ہے لیکن
لہو بھی رواں ہے میرے ہی بدن سے
تکبّر کا ہے جھوٹ نے تاج پہنا
حقیقت پریشان دار و رسن سے
ہے سوکھا پڑا یاں پہ ملتی نہیں ہے
کوئی شکل ایران کے کوہ کن سے
سخن ور تھا اپنی غزل کہنے والا
جو گھبرا گیا اس قدر اُنجمن سے
اگر درد مندی کا حامی ہو کوئی
تڑی، پار کر لو اُسی کو وطن سے

رات کی کھڑکی کھلی تاریک سا منظر لئے
اُڑ چلے ہیں نور کے طائر اُفق کے پر لئے

آسماں کی وسعتوں پہ راج بمباروں کا ہے
شہر ہے سہما ہوا جھولی میں کچے گھر لئے

گاؤں میں گولوں کے پھٹنے کا نظارہ شام کو
دیکھتی ہے ایک بچی ہاتھ میں چادر لئے

بے خبر ہیں زندگی اور موت کے اسرار سے
عقل کو تشویش ہے اور دل بھی اُن کا ڈر لئے

غیر کو آواز دے کر ہم تو رسوا ہو گئے
ہاتھ میں بھائی کے خنجر اور بہن نشتر لئے

سر بچانا تھا تو چہرہ ہی بدل لیتے فدا
اب کہاں چہرہ چھپاؤ گے تم اپنا سر لئے

تواریخ وادی میں یہ باب کیوں ہے
جہلم میں خوں کا یہ سیلاب کیوں ہے
فِضاؤں میں بارود کی بُو ہے کیسی
بلوریں تھا جو آب زہر آب کیوں ہے
مسئلہ یہ آدم کی فطرت کا ہے اب
زمیں کا کوئی خطہ شاداب کیوں ہے
بلندی سے طائر کو یہ خوف کیسا
یہاں شکرۂ مرگ بے تاب کیوں ہے
وطن، دل، فہم، گھر، سخن اور انشا
مُضرات ہی میرا اسباب کیوں ہے
چراغِ سحر میں لہو جل گیا ہے
فِدؔا شاعری ورنہ سیراب کیوں ہے

درخشان تیرا رُو قمر سا اگر ہے
تو میرا بھی دل آسمانوں کا گھر ہے
صنم سے ہر اِک آرزو کی ہے نسبت
میرا دل بھی اِک کافروں کا شہر ہے
خدا سب تو کہتے ہیں کہ ہر جگہ ہے
خبر بھی نہیں ہے کسی کو کدھر ہے
اگر شوق ہیں مرض کی کیفیت کیوں
صنم دردِ دل ہے غزل دردِ سر ہے
بہت اس کو آشوب گاہیں طلب ہے
ابھی نظر آدم فقط چاند پر ہے
فدؔا خاکساری کے دو ہی نمونے
ہے چہرا میرا ایک اک میرا گھر ہے

یہ دنیا بھی اِک نسخۂ سامری ہے
عیاں ہر کسی شئے میں کاریگری ہے
کہیں بُت پرستی میں بُو بندگی کی
کہیں بندگی کی ادا کافری ہے
اگر خاک کی زد میں دل توڑ دے دم
یہی خاکِ آدم کی خاکستری ہے
کہاں تک بچے کوئی دامِ جہاں سے
ہر اِک سمت فطرت کی جادوگری ہے
یہاں آمد و رفت ہے خواب جیسی
گُلستاں کا جائزہ سرسری ہے
فدؔا قرض کی سانس بخشی ہے ہم کو
سخی کی سخاوت میں سوداگری ہے

کلیسا و دیر و حرم میں نہیں ہے
خدا وہ نہیں ہے جو ہم میں نہیں ہے
غزل بھی اثر سے ہوئی آج خالی
کوئی جان باقی قلم میں نہیں ہے
اندھیرے اُمڈ آئے ہیں بے تحاشا
مزا اب تو وصل صنم میں نہیں ہے
مصوّر کا تصویر سے دل بُجھے کیوں
میرا رنگ اُس کی فہم میں نہیں ہے
گیا تو کہاں جذبۂ عشق میرا
ظہوروں سے نکلا عدم میں نہیں ہے
غزل گرچہ میری ہے کم پایہ تو کیا
تخلص میرا اس رقم میں نہیں ہے

سخن وری عام ہو گئی ہے
غزل بہت خام ہوگئی ہے

اندھیرے سہمے ہوئے ہیں ڈر سے
ضیا بھی نیلام ہوگئی ہے

ہیں مصنوعی گُل سجے دکاں پہ
بہار بدنام ہوگئی ہے

خراب رہتے ہیں میکدے اب
نظر نظر جام ہوگئی ہے

ہے ہوش سود و زیاں کا باقی
شراب ناکام ہوگئی ہے

فدآ مشقت ہے اب بھی جاری
غزل کہاں رام ہو گئی ہے

دل شکن اندازِ دلبر دلنوازی کیا کرے
بُت تراشی کا ہُنر آئینہ سازی کیا کرے
''دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو'' ۱ے
دردمندی سے بشر پھر بے نیازی کیا کرے
'خوبیِ جوہر سے پاتی ہے ہر اک شئے امتیاز' ۲ے
کوہ کے بے فیض پتھر کی فرازی کیا کرے
'دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں' ۳ے
شیشۂ حسرت ہے کوئی رخ طرازی کیا کرے
اِک غزل ہے رہنماؤں کی عقیدت کا ثمر
ہے عیاں سب کچھ فداؔ کوئی غمازی کیا کرے

۱: اقبالؔ ۲ بہادرشاہ ظفرؔ ۳: غالبؔ

ہے تاثیر گُفتار گر مختصر ہے
کہ تحریر دوبار ہی درد سر ہے
جو عرصے سے زیبا تھی مفلس مکاں کی
وہ تصویر بازار میں داؤ پر ہے
ہے دل کی عمر کیا ضمانت کہاں کی
کہ تقدیر دلدار اور طلب زر ہے
میرا خواب رُسوا ، ذلالت بیاں کی
کہ تعبیر ہر بار ظالم کا در ہے
اثاثہ سمیٹا ہے آمد خزاں کی
کہ توقیر دربارمُو کا سفر ہے
فدؔا خیر اب کیا رہے خانماں کی
کہ کشمیر پُر کار آتش کا گھر ہے

یہاں انجام سب کا نقش بر دیوار ہوتا ہے
وہی جو مست رہتا ہے فِدؔا ہُشیار ہوتا ہے
عناصر گرچہ سالم ہیں روانی زندگانی ہے
فِدؔا ٹھہرا ہوا پانی تلک مُردار ہوتا ہے
نہ جانے کون سے کشمیر کی تم بات کرتے ہو
فِدؔا کیا آدمی کو آدمی سے پیار ہوتا ہے
تصّور کا نیا غازہ چڑھاتا ہے وہ ذہنوں پر
نئے دن کی نئی اُلجھن فِدؔا اخبار ہوتا ہے

کبھی پتھر کبھی لاٹھی کبھی بارود کا گولہ
فدا ہر بار کیوں مفلس کے سر پہ وار ہوتا ہے
تجربہ ہے ہمیں دنیا کا ہم رشتے سمجھتے ہیں
فدا بھائی کا گھر دیوار کے اُس پار ہوتا ہے
دھڑکتا ہے جواں دل تیزاب بھی شام سے پہلے
شفا خانے کا لیکن وہ فداؔ بیمار ہوتا ہے

دنیا کی پہچان نہیں ہے
رغبت کا امکان نہیں ہے
گھر کا چہرا اُترا سا ہے
آج کوئی مہمان نہیں ہے
آوارہ ہیں میری غزلیں
ان کا کچھ عنوان نہیں ہے
کہنا تو آسان بہت ہے
کرنا تو آسان نہیں ہے
کاغذ قلم سیاہی لے لو
دولت کا سامان نہیں ہے
دل میں ہے فاروقؔ جو اُلفت
کوئی یہاں انجان نہیں ہے

حصار عہدِ وفا میں وہ بند ہو گیا ہے
ٹلا نہ اپنی جگہ سے بلند ہوگیا ہے
جلا وطن بھی جو ہتھیار بند ہوگیا ہے
میرے وطن میں آ کے اہلِ پند ہو گیا ہے
لہو جو میں جلایا چراغِ اُلفت میں
یہ شہر تب میرا احسان مند ہوگیا ہے
گلے کا ہار اُتر کے غریب کاندھوں سے
لرزتے پاؤں میں آکر کمند ہوگیا ہے
رہا حدود تکلف میں جو بچا کے زبان
وہ اپنی شادی کے دن نا پسند ہو گیا ہے
وہ جس کی ہر کوئی تصنیف پِٹ چکی ہے فدا
فسانہ لکھ کے میرا پریم چند ہو گیا ہے

ساقی نے جب تیور بدلے
میخانے کے زیورِ بدلے
رندِ کہُن کی پیاس بجھی کب
لاکھ سبو نے ساغر بدلے
تاج محل کی شان ہے قائم
پیار نے سنگِ مرمر بدلے
جتنی اس کی شہرت پھیلی
اتنے اُس نے بھی گھر بدلے
خطبے میں فقدان اثر کا
واعظ روٹھے منبر بدلے
لوگ بدل کر ہو گئے شاعر
اور ہم شاعر ہوکر بدلے

دل بے گِل

نظر کو بند کر کے کیا دِکھا ہے
سماعت سے گزر کر کیا سُنا ہے
خِرد کے پار ہے اِک آبگینہ
نشیمن تو وہی محبوب کا ہے

وہ منطق میں سما پائے گا کیسے
نظر سے وہ نظر آئے گا کیسے
وہ اپنے آپ میں ہے بھی نہیں ہے
کہاں جائے گا اور جائے گا کیسے

پرے رفتار اور گُفتار سے ہے
نہ وہ انکار اور اقرار سے ہے
خزانہ ہے مگر پوشیدہ صورت
وہ کثرت میں عیاں اظہار سے ہے

وہی جو اپنی مٹی میں دھنسا ہے
وہی میرے تعیُن میں پھنسا ہے
کھڑا کرکے یہ آئینۂ دنیا
میری حالت پہ وہ کھُل کر ہنسا ہے

یہاں مسجود ساجد ہو گیا ہے
یہاں معبود عابد ہوگیا ہے
یہ عالم خاک و باد و آب کا ہے
یہاں مشہود شاہد ہوگیا ہے

ہے جو قندیل میں ظاہر وہ کیا ہے
دِکھے حاضر تو نظروں کی خطا کیا ہے
کہوں کس سے سنے پھر کون میری
خدا تو ایک سے بھی ماورا ہے

نیاز اُس کا عجب انداز کا ہے
اُسے جو ناز ہے وہ راز کا ہے
ازّل سے ہے ابد پرواز اُس کی
زمینی خُو میں دم شہباز کا ہے

سمجھنا بات کو مشکل نہیں ہے
کہیں دل جس کو آب و گِل نہیں ہے
نہ ہے عشق نبیؐ میں مُبتلا تو
بھرا سیئنہ ہے گِل سے دل نہیں ہے

بصیرت کے فلک پر بھی سِتارے
ہیں رنگ و بو میں ملکوتی شرارے
اگر ہے عشق تو پھر دیکھ فاروقؔ
دِلوں کے شہر میں حق کے مِنارے

آئینہ

مکاں گر تیرا لا مکاں ہے خدایا
اگرچہ تو ہے غیب میری نظر سے
مگر جب تلک میری موجودگی ہے
عیاں تیرا اظہار باطن میں بھی ہے

حرم میں تیرے سامنے سر جھکاؤں
کہیں دیر میں تیری مورت سجاؤں
کبھی اس بہانے کبھی اُس بہانے
ہے اقرار کہ میرا معبود تو ہے

میری زیست تو پھر بھی احساں نہیں ہے
دوامی بتا کیوں میری جاں نہیں ہے
میرے پاس ہیں بھیک کی چند سانسیں
جو لوٹا دیا جائے کیا وہ کرم ہے

تمہاری ادا میں دوامی کی بُو ہے
تبھی تو میری نسل جاری ہے اب تک
خبر ہے مجھے تیرا آئینہ میں ہوں
مجھے توڑ دے تو یہ ممکن نہیں ہے

آزاد نظم

مٹی کا ساحل

پانی آگ ہوا کے عنصر
بے ڈھنگی مٹی کے اندر
گیلی مٹی کی تھیلی کو ہڈیوں کے ڈھانچے نے لیکن
سانچے میں ڈالے رکھا ہے
اپنی اپنی تھیلی ہے اور اپنا اپنا الگ تشخُص
قیدی ہیں سب اپنے پھر بھی
گونگوں جیسے اپنے خول کا بوجھ لئے پھرتے ہیں سارے
ایک توانائی بھی تو ہے
ایک بحر کی ایک لہر سے چھلکا پانی کا اِک قطرہ
سر کے بل گرنے کے دوران گھونٹ ہوا کی نگل گیا تو
مٹی کے ساحل پر پہنچا

اک حباب کی لمبی چوڑی بستی میں سب
اپنے جیسے چہروں کا آئینہ بن کر
آئینہ خانے کے شیشوں میں ہے خواب کی اُجلی صورت
پانی کا یہ پھیلا قطرہ حیرانی کے عالم میں ہے
ایک لہر ہے گھات لگائے
جو اپنے دامن میں لے کر
اس حباب کا سارا پانی بحر کی وسعت کو دے آئے
اور لگے ہاتھوں اِک قطرہ
اپنے دامن سے چھلکا کر
مٹی کے ساحل پر پٹکے

☆☆

نظم

دوسری دنیا

ذہن پہ تصور کی دستک ہوئی تو
نئی ایک دنیا کا اظہار پایا
جہاں کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا ہے
بشر ہر کوئی ہے محبت کا پیکر

ذرا میں نے سوچا تو احساس پایا
کہ قدرت کے ہاتھوں میں ممکن ہے سب کچھ
متعدد سیاروں میں ممکن کہیں پر
ہماری طرح ہوگی بستی بشر کی

جہاں لوگ ہو سکتے ہیں ہم سے آگے
معشیت و سائنس میں ہم سے بھی افضل
مگر ایسی دنیا ہو ممکن نہیں ہے
میں انسان کی فطرت سے واقف بہت ہوں

جو موجود ہوتی کہیں ایسی دنیا
ہمارا پتا تو لگایا بھی ہوتا
گرا کے نئ طرز کے کچھ دھماکے
ہمیں اس زمیں پر مٹایا تو ہوتا

نظم

کامیاب شاعر

شعری محفل جاری تو تھی
اور شہرت کا تنہا چاند
میری بستی کا وہ شاعر
مہمل شعر سنانے آیا

کوئی ہیروں کا بیوپاری
دولت سے سرشار ہوا تو
ننھے سے بچوں میں اپنے
ہیرے بانٹ رہا ہو جیسے

معنی کے پیاسے لفظوں سے
دانش کو جھنجھوڑ کے رکھدے
کان کے بل میں گھس کر جبراً
کڑواہٹ کو حائل کردے

ہاتھ اُٹھا کر اہلِ محفل
ڈر سے داد دئے جاتے ہیں
کہ خاموش رہے تو احمق
کم فہم سمجھے جائینگے

میں لمحہ بھر عقل کا گھوڑا
دوڑا کر جب ہار گیا تو
اِک بے کیف سا عالم لے کر
داد دہندوں میں جا بیٹھا

رُباعیات

میرا نظریہ ہر جگہ تقسیم کر شاعر
میں ہوں صدائے حق میری تعظیم کر شاعر
تُجھ کو خبر ہے کہ نہیں دنیا حقیقی شئے
تو پھر نگہ کے شوق کو تسلیم کر شاعر

شیشۂ ہستی میں پھر مجھ کو اُتارا جائے گا
اِک مجسّم میرے پیکر سے اُبھارا جائے گا
خاک میں میری کبھی اِک روح اُترے گی کوئی
زیست دے کر مجھ کو پھر اِک بار مارا جائے گا

وہی روز اور شب کے اوراق میں ہے
منوّر جو قندیلِ آفاق میں ہے
کنندہ ہے احمدؐ جبینِ فلک پر
محمدؐ بسا قلب، مشتاق میں ہے

اخبار کی سرخی کے کچھ پیکر کٹے ملے
اور جنگ سے ہستی کے کچھ منظر کٹے ملے
بغداد کی گلیوں کا جس کالم میں ذکر تھا
واں بھوک کی دہلیز پہ بھی سر کٹے ملے

جدّت کی چاہ نہ کسی قُماش کی تلاش
روٹی پہ آج بھی میرے قلاش کی تلاش
بے روزگاروں پر کسے آئے گا اب ترس
بوڑھے بھی کر رہے ہیں یاں معاش کی تلاش

میں ہوں تیرا ظہور مگر اختصار میں
میرے عدد سے آرہا ہے تُو شُمار میں
حرکت لگی جو بطن کو تیرے اے سمندر
میری ہی نبض تھی نہاں تیرے جوار میں

شعر کہنے کی ذرا تکلیف کر لیں تو کہیں
قافیہ بند صنف کی تالیف کر لیں تو کہیں
قافیہ پیما غزل گو کو وہ کہتے ہیں فدا
خود ذرا دیوان اِک تصنیف کر لیں تو کہیں

رچا ہے تیرا رقصِ افلاک انتھک
ہے گردش میں ہر آگ ہر خاک انتھک
میرا اِک نجم میرے بس میں نہ آئے
ہے مدت سے کوشش میں ادراک انتھک

تخیل سے پُر اِک کہانی مُرتب
تسلسل میں دنیائے فانی مُرتب
ملا دی کروبی و ابلیس کی خُو
بشر کی ہوئی زندگانی مرتب

قطعات

ہے بہتات اس شہر میں آسروں کی
خوشامد مگر میری فطرت نہیں ہے
میرا حسن ہے میرے شعروں کی عظمت
میری منزلت میری صورت نہیں ہے

پستی کا تُجھ میں اُس قدر احساس بھی ہوگا
اونچی ہے طائرِ فہم پرواز جس قدر
ہستی کا کاروبار اُتنا دائمی ہوگا
یہ کارگاہ رنگ و بو ہے راز جس قدر

ہر پل سے پل آنے والا ہے بڑھ کر
پرواز ہے ہر گھڑی کی عقابی
معمول ہے اب جو تجدید کل تھی
ہر کل پہ ہر آج انقلابی

کہتے ہیں اُستاد راجہ چاند پہ رکھو نظر
چند لمحوں میں بلندی کوہ کی پاؤ گے تم
اور اگر کُہسار کی چوٹی ہے تیرا مرحلہ
عمر کٹ جائے گی سر کوبی میں تھک جاؤ گے تم

قصیدہ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ

علیِ مُرتضیٰ شاہِ ولایت آفریں تحسین
شرافت و شجاعت و متانت آفرین تحسین
شریکِ حال حضرت فاطمہؓ و والدِ سبطینؓ
نبیؐ پاک سے عموّی نسبت آفرین تحسین
قدِ محتاط میں سروِ سہی حضرتؐ کی ہے تعظیم
طریقت کے سلاسل کی صدارت آفریں تحسین
بنے وہ باب صفتِ حکمت وعلمِ رسالت کے
وہی طفلان میں پہلی ارادت آفرین تحسین

وہی شمشیر دو دھاری کہ جس سے بدر بھی کانپا
کفار ومشرکین کے دل کی وحشت ،آفرین تحسین

عمرؓ، بوبکرؓ اور عثمان سے کم سِن مگر ہم سر
دِکھی خیبر کو ایماں کی حرارت آفرین تحسین

شبِ ہجرت نبیؐ کے بستر ے پہ لیٹنا اُس کا
وہاں کی موت سے طفلی شرارت آفریں تحسین

نہ انشاء میں تجلی ہے نہ ہی وسعت اگر فاروقؔ
قصیدہ ہو علیؑ کا تو سعادت آفریں تحسین

منقبت شریف

شاہِ جیلاں پیرِ پیراںؒ در دو عالم محترم
محترم شیخِ طریقت غوث الاعظمؒ محترم

شاہِ اقلیمِ ولایت و مُریدِ بُو سعید
غوثِ ثقلین و محی الدین فخرِ آدم محترم

سیدِ حسنیؒ بہ نسبت والدِ عالی مقام
تا حسینیؓ نور سوئے اُم اعظم محترم

نورِ چشمِ اُمتہ الجبار بنتِ صومعی
ارجمند فرزندِ موسیٰ مردِ محکم محترم

قد میانہ، رنگِ گندمی، ریش گنجان و جمیل
خوبصورت، خوش گلو، نورِ مجسّم محترم

نقشِ پائے احمدِ مختارؐ بر شانۂ ناز
پا بہ گردن اولیائے جملہ عالم محترم

خاکِ پائے میرؒ است فاروقؔ چہ کم ست اگر
بر درت سائل فدؔا با چشم پُر نم محترم

DEEWAN I FAROOQ

Farooq Ahmad Farooq

........نئے نام کے ساتھ شاعری کا آغاز [illegible] قوں میں
کنفیوژن confusion کا باعث بنا۔ جس کو
دور کرنے کے لئے میں اپنی اُردو شاعری کو دیوانِ فاروقؔ
کے نام سے شائع کر رہا ہوں ورنہ دیوان کی اشاعت کے
لئے نہ میرا تجربہ کافی ہے اور نہ ہی میری عمر......

